اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحم کے ساتھ

ماہنامہ

قندیلِ ادب

مارچ 2016ء

مدیر: رانا عبدالرزاق خان

07886304637 & 02089449385

rana_razzaq@hotmail.com

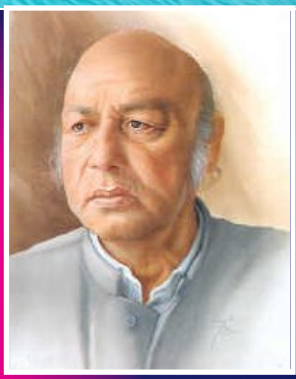

حبیب جالب

غزل

حبیب جالب

اس شہرِ خرابی میں غمِ عشق کے مارے
زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے

حسرت ہے کوئی غُنچہ ہمیں پیار سے دیکھے
ارماں ہے کوئی پھُول ہمیں دِل سے پُکارے

ہر صُبح مری صُبح پہ روتی رہی شبنم
ہر رات مری رات پہ ہنستے رہے تارے

کُچھ اور بھی ہیں کام ہمیں اے غمِ جاناں
کب تک کوئی اُلجھی ہوئی زُلفوں کو سنوارے

www.qindeel-e-adub.com

شمارہ نمبر:39 مارچ 2016ء

فہرست

ناے جو میرے نام آتے ہیں	ادارہ	1
نعت:امت الباری ناصر،میرانجم پرویز،محمد یعقوب امجد۔ غزلیات:احمد فرازل،محمد ہادی مونس،غلام محمد قاصر،مبارک صدیقی،ساغر صدیقی،حسرت موہانی،آدم چغتائی،صفی لکھنوی،ناصر کاظمی،عالم خورشید،عاصی صحرائی،احمد منیب،اطہر حفیظ فراز،اسحاق ساجد،خواجہ عبدالمومن،ضمیر کے مجرم بن یوسف،بن یوسف،نیاز جیراجپوری۔		7-3
مصلحت یا منافقت	اے،آر خان۔لندن	
ہم غیر سنجیدہ قوم	رانا عبدالرزاق خان۔لندن	8
انصار عباسی کے نام	عرفان احمد خان۔فرینکفرٹ	9
ہائرایجوکیشن کی بانی فاطمہ الظہر یٰ	زکریا ورک۔کینیڈا	10
ایس ایس پی چوہدری اسلم شہید	سید حسن خان	11
باقی صدیقی	شیراز وحید خان	11
زمین۔(فراز حمید خان) ممتاز گیت نگار صہبائی (بلال افتخار) نواب صدیق علی خان معروف اداکار سلطان راہی (فضل عمر ڈوگر)		12
ممتاز شاعر اور صحافی ڈاکٹر آذر تمنا (عبدالقدیر کوکب) خواجہ ریاض الدین عطش (اعزاز لطیف خان) منٹو کے افسانے (مظفر احمد مظفر)		13
غلاموں کی دنیا	سفیر احمد	15
ملکہ وکٹوریہ	ثقلین مبارک آسٹریلیا	16
سلطان صلاح الدین ایوبی	عاصی صحرائی	17
گھر پیارا گھر (سمین)	بھرم۔(امجد مرزا امجد)	19
توبہ کی ڈھال		20
دُعائیں کیوں قبول نہیں ہوتیں		21
مغرب میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی		23
کیا شاعری سب بیان کرتی ہے؟	ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ	25
وہ شہر جو دوسرے ممالک میں بستے ہیں	منور خورشید صاحب	26
21ویں صدی کی چند اہم ایجادات	ماموراحمد	28
دہشت گردی کا ذمہ دار صرف مولوی ہے	وجاہت علی خان مکتوب لندن	29
انتونی لائزنٹ لاوزئر فرانسیسی سائنسدان	عامر سہیل	30
دھوبی کا بیٹا	رجل خوشاب	31
شکر اپنے رب کا شکر ادا کرو	عاصی صحرائی	32
کتاب عرض ہے سے اقتباس	تحسین منور	32
اسحاق ساجد اور جمال دوست	امجد مرزا امجد۔لندن	34
جستہ جستہ	عاصی صحرائی	35

مجلس ادارت

زکریا ورک،امجد مرزا امجد،ایم اے حق بھارت،خواجہ عبدالمومن ناروے،آصف علی پرویز

نگرانِ اعلیٰ	:	خان بشیر احمد خان رفیق لندن
مدیر	:	رانا عبدالرزاق خاں
معاون مدیر	:	سید حسن خان
مدیر خصوصی	:	سہیل لون
ڈیزائنر	:	کرشن احمد
مینجنگ ڈائریکٹر	:	عاصی صحرائی
فوٹوگرافی	:	قاضی عبدالرشید،فضل عمر ڈوگر
آڈیو وڈیو	:	محمد اشرف خاکی

اراکین مشاورتی بورڈ

آدم چغتائی،منور احمد کنڈے،رضیہ اسمٰعیل برمنگھم،رند ملک کنیڈا، اسلم ناصر آسٹریلیا،اے حق یوکے ٹائمز،ثقلین مبارک آسٹریلیا،رانا مبارک احمد بحرین،بشیر احمد خان سویڈن،راجہ منیر احمد،ڈاکٹر منصور خوشتر بھارت،منور احمد خورشید۔

گزارش

ہم سب اہل علم احباب کی خدمت میں گذارش کرتے ہیں کہ اپنے ادبی فن پارے،غزل،نظم،افسانہ،مشاعرے کی روئیداد وغیرہ جو بھی اِن پیج میں ارسال کیا جائے گا۔بلاتفریق اسے معیار کے مطابق شائع کیا جائے گا۔جو دوست بھیجتے ہیں اُن کی قدر کی جاتی ہے۔قندیل ادب تمام ممالک جہاں اسے قائین موجود ہیں تقریباً دو لاکھ قارئین تک جاتا ہے اور ویب سائٹ سے بھی پڑھا جاتا ہے۔ہماری کوشش ہے کہ ہم نادر اور نئی تخلیقات کو اس میگزین میں جگہ دیں۔اور ہر بھیجنے والوں کی حوصلہ افزائی کریں،اور اس میگزین کا معیار بھی عوامی کریں۔ہر ادیب و شاعر،نقاد،افسانہ نگار،اُردو کے خدمتگار کی عزت افزائی کریں۔ہمیں کوئی صلہ مقصود نہیں۔اگر آپ نے کوئی کتاب لکھی ہے تو اس کا نام اور تعارف لکھ بھیجیں۔اگر آپ کے پاس ادبی فن پارہ کوئی نہیں تو اپنے ریمارکس ہی ارسال کر دیا کریں تا کہ ہم اپنا محاسبہ کرتے رہا کریں۔شکریہ۔

رانا عبدالرزاق خاں

اداریہ

اللہ تعالیٰ کے فضل سے قندیل ادب چوتھے سال میں داخل ہو چکا ہے اور مسلسل سب کے تعاون اور کاوش سے یہ ادب کی خدمت کر رہا ہے ۔ یہ رسالہ کسی بھی طبقاتی، مذہبی، سیاسی تنظیم کا ترجمان نہیں۔صرف اُردو ادب کا منارہ ہے۔بڑی کاوش سے 100 سو ممالک میں 2 لاکھ قارئین اس سے استفادہ کرتے ہیں۔سب احباب کے ریسپانس سے پتہ چلتا رہتا ہے۔دیار غیر میں کسی بھی اُردو میگزین کی اسقدر نہ تو پرنٹنگ ہوتی ہے اور نہ اسقدر بذریعہ انٹرنیٹ ترسیل، اور نہ کوئی اسقدر فری میں ادب کی خدمت کے لئے کوشاں ہے۔

اس کے مضامین پر اپنی رائے کا اظہار بھی نہیں کرتے ۔آپ کی رائے ،مشورہ، کسی بھی قسم کا ریسپانس ہمارا سرمایہ ہے ۔جس سے ہماری حوصلہ افزائی ہوتی ہے ۔ہمیں اپنی کوتاہیوں کو دور کرنے کا اشارہ ملتا ہے۔اور ہم پھر اس کی بہتری کے لئے کمر کس لیتے ہیں۔کسی کی کوئی بھی رائے ہوسکتی ہے۔اس میں لکھیں مختصر لکھیں، با اخلاق لکھیں، انسانیت پر لکھیں، ادب پر لکھیں، اپنا کلام، کسی کتاب پر تبصرہ، کسی مشاعرے کا حال، لطیفہ، کسی نیک اور بڑے آدمی کے حالات، ان پیج میں لکھ کر ارسال کریں۔ یہ چونکہ کمرشل رسالہ بھی نہیں ہے۔اس کا سارا خرچ خاکسار اپنی جیب سے ہی ادا کرتا ہے

(مدیر)

ثبوت: وکیل۔ جج صاحب قانون کی کتاب کے صفحہ نمبر پندرہ کے مطابق میرے موکل کو باعزت بری کیا جائے۔

جج نے کتاب کا صفحہ دیکھا تو اس کے اندر پانچ پانچ ہزار کے چار نوٹ تھے۔

جج: اس طرح کے دو ثبوت اور پیش کئے جائیں۔

دعوت: ایک چرسی نے دوستوں کی دعوت کا پروگرام بنایا۔اپنے ہی گھر سے اس نے رات کو بکرا چوری کیا اور دوستوں کی خوب دعوت کی۔صبح جب گھر پہنچا تو دیکھا کہ بکرا تو گھر میں ہی گھوم رہا ہے۔اس نے حیرت سے اپنی بیوی سے پوچھا ''یہ بکرا کہاں سے آ گیا؟؟ بیوی؛ بکرے کو گولی مارو... یہ بتاؤ، رات کو کتے کو کہاں چھوڑ آئے ہو؟

ایک ساس کا خط اپنے فوجی داماد کو:

میری بیٹی کو گھر میں اکیلے چھوڑ کر تم سرحد پر موج مستی کر رہے ہو شرافت سے میری بیٹی کے پاس کوئی بہانہ بنا کر چھٹی لے کر آ جاؤ۔فوجی داماد نے اپنی ساس کو پارسل میں ہینڈ گرنیڈ بھیجا اور لکھا کہ ڈیئر ماں جی آپ اس کی پن کھینچ لیں تو مجھے تین دن کی چھٹی مل سکتی ہے۔

عطیہ: ایک چرسی نے آنکھوں کا عطیہ دیا۔ڈاکٹر نے پوچھا آپ کچھ کہنا چاہیں گے ؟۔چرسی؛ ہاں جسے بھی یہ آنکھیں دینا اسے بتا دینا کہ یہ آنکھیں دو کش لگانے کے بعد ہی کھلتی ہیں۔

نامے جو میرے نام آتے ہیں

محترم ہادی مونس صاحب کنیڈا سے رقم طراز ہیں:

محترم ایڈیٹر صاحب قندیل ادب

السلام وعلیکم

خاکسار جامعہ احمدیہ کنیڈا میں اُردو فارسی کا پروفیسر ہے۔آپ کے دو شمارے نظر سے گزرے۔ادبی ذوق کی تسکین کے لئے یہ رسالہ ایک نعمت ہے رسالے کی اشاعت پر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ خدا تعالیٰ آپ کو مزید ترقیات سے نوازے۔آمین۔ایک غزل برائے اشاعت پیش خدمت ہے۔آئندہ رسالہ مندرج ایڈریس پر ارسال کریں تو ممنون ہوں گا۔

محترم تحسین منور صاحب ایڈیٹر دہلی انڈیا لکھتے ہیں:

محترم مدیر صاحب قندیل ادب

السلام وعلیکم

قندیل ادب کا تازہ شمارہ ملا۔آپ جو کام کر رہے ہیں وہ اردو کی نئی بستیوں میں، اردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں اردو تاریخ آپ کی اس کوشش کو فراموش نہیں کرے گی ۔محترم منور رانا کی کتاب پر یہ تبصرے کا کچھ حصہ برائے اشاعت ارسال ہے۔

محترم عقیل احمد گوہر لندن سے لکھتے ہیں:

محترم ایڈیٹر صاحب تسلیمات

قندیل ادب کا تازہ شمارہ ملا۔آپ کا میگزین بہت اچھا تھا۔شروع میں ساغر صدیقی کی غزل، پھر معروف شعراء کا کلام تھا۔بہت ہی اچھی شاعری ملنے کو ملی، آپ کے مضمون میں پاکستان کے حالات پر سچا تبصرہ ملنے کو ملا۔ملک کی بھانک تصویر دیکھی۔مزید مضامین بھی بہت معیاری ہیں جتندر بلو کا افسانہ قابل تعریف تھا۔براہ مہربانی مجھے قندیل ادب ارسال کرتے رہا کریں۔شکریہ

تصحیح

شمارہ فروری میں ادارے کی غلطی سے ایک افسانہ ''آخری پڑاؤ'' امجد مرزا امجد کے نام سے شائع ہو گیا تھا۔جبکہ یہ افسانہ جتندر بلو صاحب کا تھا۔محترم امجد مرزا امجد صاحب نے فون پر ہماری اس غلطی کو درست کروایا۔ممکن ہے کچھ کاپیاں احباب کے پاس پہنچی ہوں۔اسی وقت یہ درستی کر دی گئی تھی۔ادارہ اس غلطی پر معذرت خواہ ہے۔ احباب نوٹ فرمالیں۔

(مدیر)

غـــزل

نعت۔امت الباری ناصر

ایک ہی انسان ہے انسان کامل بالیقیں
انسان کامل سا حسیں کوئی ملائک میں نہیں
وہ سراپا نور ہے اور نور بھی اعلیٰ تریں
نور اس جیسا ستاروں،چاند سورج میں نہیں
ساری دنیا میں کسی دریا سمندر میں نہیں
الماس موتی لعل یاقوت و زمرد ر میں نہیں
غرضیکہ ارض و سما میں کوئی اس جیسا نہیں
سید و مولا ہمارے ارفع و اکمل تریں
سید الاحیاء محمد مصطفیٰ سب سے حسیں
حسن و خوبی میں کوئی اس فرد کا ثانی نہیں
خوشہ چینی ہے مسیحائے زماں کے باغ سے
ورنہ ایسی نعت کہنا میرے تو بس میں نہیں

نعت۔میر انجم پرویز

میں تیری مثال کہاں
تو کہاں اور میرا خیال کہاں
خود خدا بھی کرے ثنا تیری
اِس سے بڑھ کر بھلا کمال کہاں
سدرۃُ المنتہیٰ تری منزل
کوہِ سینا پہ وہ وصال کہاں
تُو ہی تھا حاملِ کتابِ نُور
پربتوں کو تھی یہ مجال کہاں
اِک زمانے کی ظلمتوں کے بعد
یوں ہوئی روشنی بحال کہاں
آبِ کوثر جو لائے ہیں ساقی
ہے مرا شیشۂ سفال کہاں
چھوڑ کر تیرا در، شفیعِ محشر!
مجھ سے عاصی کریں سوال کہاں
دیکھیئے ! آج ارضِ 'کدعہ' میں
پھر اُگ آیا ہے وہ نہال کہاں
باغِ احمدؐ جو پھر ہوا سر سبز
حشر تک اب اسے زوال کہاں

نعت۔محمد یعقوب امجد

ہے شمع رسالت فروزاں فروزاں
وہ خُلق مجسم ،وہ رحمت کا عالم
عقیدت کی راہیں کشادہ کشادہ
اے آہو! تو بھٹکا ہوا ہے حرم سے
ذرا آنکھ کھولو یہ کیا ماجرا ہے
ہے اسلام گر چہ محبت سراپا
تو آہیں یہ کیسی شبستاں شبستاں
ہیں مظلوم سارے نچھاور انہیں پر
جو رحمت کو لائے فراواں فراواں
جو خُلقِ محمدؐ کو اُسوہ پکڑتے
تو رہتے مسلماں نمایاں نمایاں
ستمگار دنیا کے ظلمت کدے ہیں
ہے مسلم ابھی تک پریشاں پریشاں
رسالت کے خادم کہیں ان کو کیسے
جو رہتے ہیں خنجر بداماں بداماں

غزل۔احمد فراز

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے
تو محبت سے کوئی چال تو چل
ہار جانے کا حوصلہ ہے مجھے
دل دھڑکتا نہیں ٹپکتا ہے
کل جو خواہش تھی آبلہ ہے مجھے
ہم سفر چاہیئے ہجوم نہیں
اک مسافر بھی قافلہ ہے مجھے
کوہ کن ہو کہ قیس ہو کہ فرازؔ
سب میں اک شخص ہی ملا ہے مجھے

غزل۔محمد ہادی مونس

نقشہ کشی نہ ہو سکی دل کے غبار کی
ناساز گار گردش لیل و نہار کی
بیٹھے ہوئے ہیں ہم راہِ گزار پر
کیا چاشنی ہے اس طرح کے انتظار کی
باتیں ہیں ذہن میں کئی ہجر و وصال کی
گلدستہ بہار کی یا نوکِ خار کی
جو جستجوئے شوق میں پامال ہوگئے
تصویر بن گئے ہیں کسی یادگار کی
خوابوں کے شیشے ٹوٹ کر آنکھوں میں چُبھ گئے
صورت نہیں ہے اب کوئی صبرو قرار کی
مجنوں پکار کر ہمیں رُسوا کیا گیا
تشہیر اس طرح تو نہ کر میرے پیار کی
لعلِ یمن سے کچھ کم نہیں جذبہ خلوص
قیمت کا کیا سوال گہرِ آبدار کی
امید رنگ لائے گی یا جان جائے گی
کارِ جنوں میں بات نہیں اختیار کی
مونسؔ محاسبہ تو کرو اپنے نفس کا
جنت نہیں ہے دور پھر تقویٰ شعار کی

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

غزل۔غلام محمد قاصرؔ

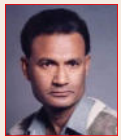

بارود کے بدلے ہاتھوں میں آجائے کتاب تو اچھا ہو
اے کاش ہماری آنکھوں کا اکیسواں خواب تو اچھا ہو

ہر پتا نا آسودہ ہے ماحولِ چمن آلودہ ہے
رہ جائیں لرزتی شاخوں پر دو چار گلاب تو اچھا ہو

یوں شور کا دریا بپھرا ہے چڑیوں نے چہکنا چھوڑ دیا
خطرے کے نشان سے نیچے اب اترے سیلاب تو اچھا ہو

ہر سال کی آخری شاموں میں دو چار ورق اڑ جاتے ہیں
اب اور نہ بکھرے رشتوں کی بوسیدہ کتاب تو اچھا ہو

ہر بچہ آنکھیں کھولتے ہی کرتا ہے سوال محبت کا
دنیا کے کسی گوشے سے اسے مل جائے جواب تو اچھا ہو

غزل۔مبارک صدیقی

ہجر کی کالی رات میں اُٹھ کے دل کے دیپ جلا
آنکھ کے مر جانے سے پہلے آنسو چار بہا

نفس کے کالے جادو گر سے جلدی جان چھڑا
اُس کی یاد میں ایسے رو کہ ہستی جائے ہل

وقت نکال کسی دن تھوڑا اپنے آپ سے مل
تنہائی میں بیٹھ کسی دن خود سے مانگ حساب

کتنے تو نے خار چُنے ہیں کتنے پھول گلاب
دو آنکھوں میں پال لئے ہیں تو نے دو سو خواب

تُو نے خود کو جان لیا ہے شائد سب سے تیز
وقت کی دیمک چاٹ گئی ہے رُستم اور چنگیز

بات سمجھنے والی ہے دل کو یہ سمجھا
جیسے تیسے ہو سکتا ہے جا کے یار منا

آنکھ کے آنسو، پیر کے چھالے، دل کے زخم دکھا
اُس سے کہنا، کیا کہنا ہے، کیا میری اوقات

کردے مجھ پہ اپنے پیار کی رِم جھم سی برسات

غزل۔ساغر صدیقی

چراغ طور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے
ذرا نقاب اٹھاؤ بڑا اندھیرا ہے

مجھے خود اپنی نگاہوں پر اعتماد نہیں
میرے قریب نہ آؤ بڑا اندھیرا ہے

وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
انہیں کہیں سے بلاؤ بڑا اندھیرا ہے

ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے
ابھی فریب نہ کھاؤ بڑا ندھیرا ہے

غزل۔حسرت موہانی

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا
اور تیرا دانتوں میں وہ اُنگلی دبانا یاد ہے

کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونہ دفعتاً
اور دوپٹے سے تیرا وہ منہ چھپانا یاد ہے

تجھ کو تنہا جب کبھی پاتا تو اَزراہِ لحاظ
حال دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے

دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے
جب منا لینا تو پھر خود رُوٹھ جانا یاد ہے

دوپہر کی دُھوپ میں مجھ کو بلانے کے لئے
وہ تیرا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

غزل۔آدم چغتائی برمنگھم

مصنوعی خداؤں کی پرستش نہیں کرتے
ہم اُن کے مقاصد کی ستائش نہیں کرتے

پھیلے ہیں زمانے میں اگر جھوٹ کے آثار
کیوں صدق و صفا کے لیے کوشش نہیں کرتے

جب وقت پڑے خون سے سینچیں گے چمن کو
گو اس کی حمایت کی نمائش نہیں کرتے

سہ لیتے ہیں چُپ چاپ زمانے کے مظالم
آدمؔ کبھی زخموں کی نمائش نہیں کرتے

غزل۔صفی لکھنوی

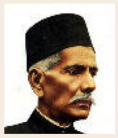

غزل اُس نے چھیڑی ہے مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

قفس لے اُڑوں گا اب جو سنکے
مدد اتنی اے بال و پرواز دینا

نہ خاموش رہنا میرے ہم صفیرو
جب آواز دو تم بھی آواز دینا

کوئی سیکھ لے دل کی بے تابیوں کو
ہر انجام میں رنگ آغاز دینا

دلیل گراں باری سنگ غم
صفی ٹوٹ کر دل کا آواز دینا

غزل۔ناصر کاظمی

نیت شوق بھر نہ جائے کہیں
تُو بھی دل سے اتر نہ جائے کہیں

آج دیکھا ہے تجھ کو دیر کے بعد
آج کا دن گزر نہ جائے کہیں

نہ ملا کر اُداس لوگوں سے
حسن تیرا بکھر نہ جائے کہیں

آرزو ہے کہ تو یہاں آئے
اور پھر عمر بھر نہ جائے کہیں

جی جلاتا ہوں اور یہ سوچتا ہوں
رائیگاں یہ ہنر نہ جائے کہیں

آؤ کچھ دیر لو ہی لیں ناصر
پھر یہ دریا اُتر نہ جائے کہیں

غزل۔عالم خورشید

در و دیوار کی زنجیر سے آزاد ہو جانا
جنوں اب چاہتا ہے دشت میں آباد ہو جانا
نئی دیوانگی ہے اک دن خود ہی سمجھ لے گی
بہت آساں نہیں ہے عشق میں فرہاد ہو جانا
محبت خوب یہ انجام ہے اہل محبت کا
تجھے آباد کرنا اور خود برباد ہو جانا
ازل سے دل کی بستی کا یہی معمول ہے شاید
کبھی ویران ہو جانا کبھی آباد ہو جانا
ہمار احق طلب کرنا تجھے اچھا نہیں لگتا
ہمیں آتا نہیں کاسۂ فریاد ہو جانا
ستم کے موجودوں کو کیوں بھلا حیران کرتا ہے
کسی مظلوم کا ایک دن ستم ایجاد ہو جانا
مرض اپنا پرانا ہے اچانک بے سبب عالم
کبھی دلشاد ہو جانا کبھی ناشاد ہو جانا

غزل۔عاصی صحرائی

اِک دیا ہے خواہشوں کے درمیاں
گیسوئے عشرت بھی ہیں اس میں نہاں
اِک پُھبن ہے پائے منزل کا نشاں
ڈھونڈتا پھرتا ہے کیوں تو کارواں
کاشی میں راحت ہے نہ ہی دیر میں
قُربِ کعبہ کا ہے دُھندلا نشاں
ڈوب جائیں گے کروڑوں جن و انس
خون میں بہہ جائے گا ہر اک نشاں
کھٹکھٹاتا کیوں تو نقابِ دہر کو
پُشت پر کتنے چھپے ہیں بد گماں
ہے ٹپک چھالوں میں رستہ بھی کٹھن
پھوٹ کر برسے گا ابرِ آسماں
وجد میں لیلائے فن ہے آج کل
حرف ِ عاصیؔ ہو گیا ہے بے گماں

غزل۔احمد منیب

دولت اشک لُٹائی ہے تو کچھ بات بنی
ورنہ کیا ایسے ہی یہ تاروں بھری بات بنی
رنگ رنگوں سے ملے ہیں تو رنگ آیا
ایک جب ذات مٹی دوسری تَب ذات بنی
اِک محبت میں مچلتے دو دلوں کی خاطر
اَن گنت قطروں نے دی جان تو برسات بنی
جب ملے لوگ تو لوگوں سے بھی ڈر لگتا تھا
پر ملے لوگ تو لوگوں سے ہی بارات بنی
چند تنکوں کی ہی تعمیر ہے گھر فاختہ کا
چند تنکوں سے ہی صیّاد کی ہے گھات بنی

غزل۔اطہر حفیظ فراز

وہ سامنے کھڑے رہے، ہنسے گئے، لٹے گئے
میں شعر یوں کہے گیا عنایتوں کی اوٹ میں
قدم قدم دھیان سے، جہاں بہت بدل گیا
کہ راہزن چھپے ہوئے ہیں رہبروں کی اوٹ میں
قدم قدم چلے گیا میں ہر بلا کو بھول کر
کہ منزلیں نظر میں تھیں مسافتوں کی اوٹ میں
لرز کے دل مچل گئے، خدائی بھی یہی تو ہے
قزح کا رنگ تھا چھپا جو بجلیوں کی اوٹ میں
میں خود پیوں یا وعظ دوں، یہاں سے کچھ لگاؤ ہے
مجھے اگر ہو ڈھونڈنا تو میکشوں کی اوٹ میں
اس کے دور کا نشاں تھی جنبشِ زمین بھی
صداقتیں دکھا گیا وہ زلزلوں کی اوٹ میں
خدا نے یہ کہا فراز! کوئی سوال ہے تو کر
تری طلب کئے گیا عبادتوں کی اوٹ میں

غزل۔اطہر حفیظ فرازؔ

میں جس کو ڈھونڈتا رہا پہیلیوں کی اوٹ میں
''نظر پڑی تو چھپ گئی سہیلیوں کی اوٹ میں''
ہوا کے زور زور سے وہ زُلف یوں بکھر گئی
کہ جیسے چاند چھپ رہا تھا بدلیوں کی اوٹ میں
میں تجھ کو کیوں نہ جان لوں تو مجھ میں یوں سماتی ہے
گلاب کی مہک جدا چنبیلیوں کی اوٹ میں
بشر بشر کی رُوح پر عجب طرح کا وجد ہے
غزل سرا ہوا کوئی سماعتوں کی اوٹ میں
میری غزل کا معجزہ کہ جس کو سُن کے جانِ جاں
چھپا رہی تھی چاند وہ ہتھیلیوں کی اوٹ میں
مری کٹھن سی وادیوں میں میرے ساتھ ساتھ ہے
پلی بڑھی تھی وہ جو کبھی نزاکتوں کی اوٹ میں
مجھے وہ گاؤں دیکھ کر طرح طرح کی ضد کرے
اِدھر اُدھر چھپ گئی حویلیوں کی اوٹ میں
حقیقتِ حیات میں میں وہ جمال پا گیا
جو اک پری حسین تھی کہانیوں کی اوٹ میں
خدا کا حق ادا کروں نوازتا ہے بے بہا
کہ خواب اک بدل گیا حقیقتوں کی اوٹ میں

دستک۔اسحاق ساجد (جرمنی)

رات بیٹھا تھا
تری ہاتھ میں تصویر لیے
موند کے آنکھیں
ایسا کھویا تھا
کہاں کھویا ہوں
کچھ نہ تھا معلوم
جانتا ہی نہ تھا
کیا ہے میرے اندر کی طلب

دفعتاً چونک اٹھا
جاگ اٹھا
نیند سے میں
سن کے دروازے پہ
دستک کی صدا
دل کی رفتار ہوگئی دونی
دیئے آنکھوں کے ہوگیے روشن
اور پھر دوڑ کر پہنچا جو میں
دروازے پر
کھول کر دیکھا جو دروازہ
وہاں کوئی نہ تھا
ہو کے مایوس
یہی آیا مرے دل میں خیال
جس کو سمجھا تھا میں دستک
نہ تھی دستک وہ مرے
اپنے ہی دل کی دھڑکنے کی
صدا تھی شاید!!

غزل۔خواجہ عبدالمومن ناروے

دیکھے ہیں حسیں میں نے زمانے میں ہزاروں
پر حسن ترا سارے حسینوں سے سوا ہے
کیا نور ہے جو تجھ کو ملا ماہِ مبیں سے
کیا رنگ ہے جو سارے زمانے سے جدا ہے
لب کھلتے ہی پھولوں کی مہک آتی ہے تجھ سے
ہر دل پہ ترے نطق کا جادو سا چلا ہے
سوتا ہوں تو خوابوں میں نظر آتا ہے مجھ کو
حیراں ہوں تو خانہ ویراں میں بسا ہے
کچھ روشنی جو مجھ میں سدا رہتی ہے روشن
یہ تیرا کرم تیری محبت کی ضیاء ہے

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اُسکے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

غزل۔ضمیر کے مجرم بن یوسف

سجدہ ریزی بھی کریں رب کی عبادت بھی کریں
غیر کے مال امانت میں خیانت بھی کریں
قول اور افعال میں ایسا تضاد ہے جن کے
درس حاتم کا دیں خود بخل نہایت ہی کریں
نقل کو اصل کہیں اصل کو نقل جانیں
اپنے اندازِ گفتگو میں ملاوٹ بھی کریں
خود کہ مخلوق خدا میں جو سر بلند رہیں
ایسا کرنے کے لئے خود میں بناوٹ بھی کریں
بہت عجیب ہے معیار دوستی جن کا
کہ جس کی آڑ میں جی بھر کے عداوت بھی کریں
کچھ کریں یا نہ کریں اتنا تو کر لیں بن جی
اپنے کردار پے احساس ندامت ہی کریں

سپاہ پاکستان۔بن یوسف

خود اپنے دیس کو لٹتے ہوئے اہل نظر دیکھیں
تڑپتے کب تلک سڑکوں پے وہ اپنے پسر دیکھیں
تلے رہتے ہیں ظالم فوج کو پامال کرنے میں
کہ گھر کے بھیدیوں کو سنگ میں ان کے اگر دیکھیں
سمجھتے ہیں جو سپاہی کو جو اپنی راہ کا شمن
انہیں جب لوگ عزت بیچتے غیروں کو اگر دیکھیں
یہ مانا پر کشش جمہوریت لگتی ہے ہر ذی کو
دکھاوا ہی دکھاوا ہے جدھر جائیں جدھر دیکھیں
جو ہو دہشت گردی آفت ہو یا موقع الیکشن کا
ہزاروں پاسبانوں کو جو جاں دیتے اگر دیکھیں
جو پودے کبھی افواج نے بوئے تھے گلشن میں
اب اپنی بلیوں کو کرتے میاؤں راہبر دیکھیں
کرپشن کو پنپتا برہنہ مادر پدر دیکھیں
یہود و نصاریٰ ہندوؤں کو ساتھ میں لے کر
کہ ہیں اغیار کی دولت کدوں میں جن کا کالا دھن
میسر دال اور سبزی نہ ہو جب بے زبانوں کو
مگر جس میں دخل ہوتا نہیں لوگوں کی مرضی کو
کہ خود ہو جائے جب بے آسرا مالی بھی گلشن کا
اکٹھا ہو کے وہ لڑنے کو ہیں گھمسان کے رن میں
نہ دیکھیں فوج کی جانب تو پھر آخر کدھر دیکھیں

بولتا پاکستان۔بن یوسف

ندائے وقت ہے یہ ابتدائے جنگ کرو
اُٹھو ظالمو عرصہ حیات تنگ کرو
نام تو رکھ دیا جس نے میرا پاکستان
نہ رکھ سکا میری حرمت بمطابق قرآن
ازل سے ظلم کر رہا ہے یہ جابر مجھ پے
بددعا دیتا ہوں لعنت اللہ تجھ پے
بدل کے بار بار آتا ہے چہرے اپنے
اور کہتا ہے کہ ہم تو ہیں تیرے اپنے
میری دھرتی کی ہریالی پہ ہے قبضہ جس کا
مخبری کی عوض کس نے دیا بدلہ جس کا
کہ جس نے لیا وقت کے نوابوں سے
عوض میں جس کے نوازا بڑے خطابوں سے
منافقت میں کوئی اس کا نہ ثانی دیکھا
قرآن وسنہ کے جانے نہ وہ معنی، دیکھا
دھرتی ماں کہتا ہے اور روز بیچتا ہے مجھے
شرم کو دھو کے پی گیا نہیں آتی ہے تجھے
سر پے ٹوپی لئے اور ہاتھ میں تسبیح پکڑے
ہیں ریا کاری سبھی اس نظام میں جکڑے
اس کے پالتو ہیں سب کے سب ذخیرہ اندوز
ہیں جن کی مٹھی میں بند اشیائے خورد نوش
ان ہی کی جس میں ملاوٹ کرشمہ سازی ہے
گرانی بھی اس کے گھر کی شہزادی ہے
کچے بانٹو سے تولتے ہیں قسم کھاتے ہیں
اسی وجہ سے تو مجھ پے عذاب آتے ہیں
گلے سڑے ہوئے نظام کے کردار ہیں یہ
مہذب اعلیٰ خادموں کے بھتے دار ہیں یہ

اُردو زبان - نیاز جیراجپوری

شہد ہے شبنم ہے اور شہنائی ہے اُردو زباں
شیریں ہے شفّاف ہے سُکھ دائی ہے اُردو زباں
ہندو مُسلم سِکھ عیسائی سبھی کی ہم نشیں
سب اِسے اور سب کو ہی راس آئی ہے اُردو زباں
ہے یہیں جنمی پلی دامن میں ہندوستان کے
کون کہتا ہے کہیں سے آئی ہے اُردو زباں
دیکھئے عینک ہٹا کر بُغض و نفرت کی جناب
چھا رہی ہے چھائے گی اور چھائی ہے اُردو زباں
قومی یکجہتی اخوت پیار جِس کے رنگ روپ
وہ ہی تو کہلاتی میرے بھائی ہے اُردو زباں
جنگِ آزادی میں بھی اِس کا کلیدی رَول تھا
ہے جو جگ ظاہر وہی سچّائی ہے اُردو زباں
کل تھی اِنشاء اللہ کل بھی یہ رہے گی تازہ ہی
حیف ! صد حیف !! آج جو مُرجھائی ہے اُردو زباں
شخصیت میں چار چاند آکر لگا دیتی ہے یہ
ہے شعور و فہم اور دانائی ہے اُردو زباں
ذہن و دِل میں خیمہ زن بَن کر بہاروں کی سفیر
رُوح افزا جاں فزا پُروائی ہے اُردو زباں
ہے دھنک کے سات رنگوں کا نُمایاں اِمتزاج
دِل کشی ہے حُسن ہے رعنائی ہے اُردو زباں
رقص کرتے ہیں حسیں خوابوں کے خاکے آنکھوں میں
نیند کی خُوشبو کہیں سے لائی ہے اُردو زباں
ذہن و دِل لُطف و لطافت سے ہُوئے ہیں مالا مال
جب سے مجھ کو تھوڑی تھوڑی آئی ہے اُردو زباں
ماں کی ممتا سے تو مَیں بچپن سے ہی محروم ہُوں
اب تو لگتا ہے کہ میری مائی ہے اُردو زباں
ہے جہاں اُردو وہاں رونق ہی رونق ہے نیازؔ
زیب ہے زیبا ہے اور زیبائی ہے اُردو زباں

مصلحت یا منافقت (اے آر خان۔لندن)

ہمارے معزز جج صاحبان ہائی کورٹس اور سپریم کورٹس جو یقیناً اکثر مقتدر اشاروں کے منتظر رہتے ہیں۔جب تک ان کا قبلہ دُرست نہیں ہوتا۔ملک کا قبلہ بھی دُرست نہیں ہوسکتا۔اب ان عدالتوں میں بیٹھے جج صاحبان کو یہ فیصلہ جلد کر دینا ہوگا۔کہ ''6۔اپریل 2007 کو (اسلام آباد کی سرکاری لال مسجد کے ملازم) مولانا عبدالعزیز نے خود کو ''امیر المومنین'' مقرر کر کے پورے ملک میں شریعت نافذ کر کے، مسجد میں شرعی عدالت قائم کر کے، ریاست کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا تھا اور مسجد اور اس سے ملحقہ جامعہ حفصہ میں چھپے شریعت کے داعی عورتوں اور مردوں کے خلاف صدر جنرل پرویز مشرف کے حکم پر پاک فوج کا ''sunrise operation'' کیا غیر قانونی، خلافِ شریعت تھا؟ اور 12 جولائی 2007 کو اسلام آباد میں امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد مرحوم، مولانا فضل الرحمن اور مولانا غفور حیدری کے اس ''مشترکہ فتوے'' کی کیا حیثیت ہے کہ ''ہم لال مسجد پر بمباری کرنے والوں کو کافر سمجھتے ہیں۔اور امریکی مفادات کے لئے مارے جانے والے پاک فوج کے افسروں اور جوانوں کو ''شہید'' نہیں سمجھتے۔'' طالبان کے باپ'' کہلانے والے مولانا سمیع الحق نے اپنی صدارت میں لاہور کے 15 فروری 2014 کے 20 مذہبی جماعتوں کے راہنماؤں اور 200 علماء کے اجلاس میں طالبان کو ''پاکستان کے بیٹے'' تسلیم کرایا تھا۔جماعت اسلامی کے سابق امیر سید منور حسن بھی پاک فوج کے شہیدوں کو ''شہید'' ماننے سے انکاری ہیں۔اور جہاد و قتال کا فلسفہ عام کرنے کا فتویٰ دے چکے ہیں۔مولانا عبدالعزیز جمہوریت کو ''کفر کا نظام'' قرار دے چکے ہیں۔اُن کی بیگم اُمّ حسان کی مدرسے کی معلمات اور طالبات علی الاعلان ''داعش'' کا پروپیگنڈا کر رہی ہیں۔مولانا عبدالعزیز کی نگرانی میں 18 مدرسوں میں داعش'' کا فتنہ پھیلایا جا رہا ہے۔آصف علی زرداری کے بعد میاں نواز شریف بھی دہشت گردوں کے سہولت کاروں کے نرغے میں ہیں۔اور چوہدری نثار ان کے لئے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ہمارے وطن میں منافقت نے ڈیرے ڈال لئے ہیں، کرپشن کے کالے سائے ہیں، ضیاع الحق کے چنگیزی دور نے اس نام نہاد علمائے اسلام کو ایسا سر پہ چڑھایا کہ وہ اب سارے محکموں میں مضبوط اور مقتدر ہے۔مذہب کا ایسا تانا بانا سعودی ریال سے بُنا گیا کہ اب اس سے جان نہیں چھوٹتی۔طالبان، القائدہ، داعش یہ سب ملاں کے ڈراؤنے ہتھکنڈے ہیں۔جن سے قوم کے بزدل لیڈر خوف زدہ ہیں۔دہشت گرد ہر جگہ مضبوط ہو رہا ہے۔عدلیہ فیصلہ شدہ مقدمات کے مجرموں کو پھانسی دینے کا جرات مندانہ فیصلہ کرنے سے خوفزدہ ہے اور سیاسی لیڈرز اس کام کو اپنے ذمہ لینے سے کتراتے ہیں۔ملٹری کورٹ کے فیصلوں پر عملدرآمد ہو چکا ہے۔قوم کے اکابریں اور عدلیہ کی بزدلی کسی گھمبیر صورت حال کی پیش خیمہ ہوسکتی ہے۔سیاستدان اور فوج کبھی بھی ایک پیج پر نہیں رہے۔ہماری قوم میں میر جعفر و صادق کی کمی نہیں۔سنا ہے کہ RAW نے بھی پنجاب بلکہ سارے پاکستان میں اچھی خاصی انوسٹمنٹ کر رکھی ہے۔نیشنل ایکشن پلان پر سنجیدگی سے عمل نہیں ہو رہا، گڈ طالبان اور برے طالبان کا ابھی بھی ڈھونگ رچایا جا رہا ہے۔ہمارے ہاں ایمان فروشوں کی کمی نہیں۔اگر کسی بھی مردِ آہن نے اس صورتِ حال کو سنجیدگی سے face نہ کیا۔اور (سانوں کی) کہہ کر گزر گیا۔تو تاریخ اور قائداعظم کی رُوح اُسے کبھی بھی معاف نہ کرے گی۔اور پھر ساری یہ بدبخت قوم صدیوں تک بنی اسرائیل کی طرح بے آب و گیاہ غلامی کے صحرائے سینا میں بھٹکتی پھرے گی۔اور آنے والی نسلیں اس ناشکری، بے عمل، کرپٹ قوم پر اور اس کے سیاہ کرتوتوں پر ہزار ہزار لعنت بھیجا کریں گی۔کہ اے بدبختو! خدا تعالیٰ کی سب نعماء ہونے باوجود، تم ایک قوم نہ بن سکے اور انسان سے ایک باخدا انسان بننے سے قاصر رہے۔اور ایک بت پرست قوم تمہاری بدعملی کی وجہ سے تم پر غالب آ گئی۔تمہارے نعرے، تمہیں نہ بچا سکے۔واقعی تم حکمرانی کے نہیں غلامی کے لائق قوم ہو۔انا للہ و انا الیہ راجعون۔

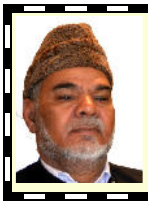

ہم غیر سنجیدہ قوم

(رانا عبدالرزاق خان لندن)

ملک پاکستان میں صرف دو فیصد افراد اقتدار کے ہمیشہ مزے لیتے رہے ہیں۔ پہلے جاگیرداروں نے ،پھر تاجروں نے ،اب سیاسی لیڈروں نے اس اقتدار کے مزے لئے۔علمائے سُو کی بھی خوب چاندی ہوئی۔عام اور متوسط طبقہ اور مظلوم اقلیتیں اس ملک کی بٹھی کا ایندھن ہیں۔جب سے یہ مادرِ وطن وجود میں آیا۔مفاد پرستوں نے اسے ہر طرح سے لوٹا۔بلکہ اس کے نظریئے تک کو نقصان پہنچا کر اپنی من مانی کے قوانین بنا کر اس ملک کا بیڑہ غرق کیا۔محبت کی بجائے نفرت اور انتشار کے بیج بوئے اور ساری قوم کو منتشر کر کے اپنے مفادات کی ڈفلی بجائی۔ملک بنتے ہی اس کے قوانین جو حضرت قائداعظم چاہتے تھے ان کا قلع قمع کیا گیا۔گروہی سیاست نے آن ڈیرہ جمایا۔جس کے ڈانڈے مذہبی علماؤں سے ملتے تھے جن کو قائداعظم نے کانگرسی ہونے کے ناطے گھاس تک نہیں ڈالا تھا۔چونکہ یہ گروہ مخالف پاکستان تھا اس نے ملک میں داخل ہوتے ہی پر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے۔قائداعظم کی وفات کے بعد تو ان کی چاندی ہوگئی۔عوام کالانعام کو ان کے گھمبیر عزائم کی کیا خبر۔لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد بالکل ہی کھلم کھلا یہ گم گشتہ بھیڑیئے شیر کی مانند دھاڑنے لگے۔ایوبی دور میں تو ترقیاتی کام ہوئے مگر مشرقی پاکستان کو قدرے محروم رکھا گیا۔۱۹۶۵ء میں بھارت سے جو جنگ کا فیصلہ تھا۔یہ بھی ایک احساسِ برتری میں غیر سنجیدہ فیصلہ تھا۔کیا کچھ گیا۔قوم کو بتایا کچھ گیا۔مشرقی پاکستان کی محرومیاں جب بڑھنے لگیں تو ۱۹۷۱ء کا سانحہ پیش آیا۔یہ بھی غیر اسلامی ٹیڑھی سوچ،متعصب رویے کے نتائج تھے۔مغربی پاکستان کے مقتدر طبقے کی حماقتوں سے وطن عزیز کا نصف حصہ جاتا رہا۔میں آج پوچھتا ہوں اُن دعوے داروں سے جو یہ کہتے نہ تھکتے تھے کہ مشرقی پاکستان ہماری اکانومی کو نقصان پہنچا رہا ہے۔آج اس کی اکانومی پاکستان سے بہت آگے ہے۔صرف اس کے پاس ایٹم بم نہیں۔ہاں اس کے بعد ایک اور غیر سنجیدہ فیصلہ کیا گیا۔

پھر بھٹو صاحب نے مولانا بن کر ایک کرپٹ پارلیمنٹ سے ایک مسلمان فرقے کے ایمان کا فیصلہ شاہ فیصل کی دولت لیکر اور نام نہاد ٹھیکیداران اسلام علمائے سُو کے ساتھ مل کر کیا۔یہ بھی ایک مضحکہ خیز فیصلہ تھا۔جو انتہا پسندی کی بنیاد رکھ کر مستقبل کے حالات کا پیش خیمہ بنا۔بعد میں میں اس انتہا پسندی نے اس سارے ریجن میں خون کی نہریں چلا دیں۔جو اب تک چل رہی ہیں۔اور ایسے غیر سنجیدہ فیصلوں نے پاکستان کا وجود خطرے میں ڈال دیا۔اُس دور میں علمائے سو کی طرف سے ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ قادیانیوں کو کلیدی اسامیوں سے ہٹایا جائے۔جب سے اُن کو کلیدی اسامیوں سے الگ کیا گیا۔اس کے بعد ان سرکاری امینوں کا کردار دنیا دیکھ رہی ہے۔اب ان کلیدی اسامیوں پر اجمان بڑے بڑے گرگ بدنام زمانہ ڈاکو مشہور ہیں۔مگر شرم تم کو نہیں آتی۔جبکہ کسی قادیانی آفیسر پر کوئی کرپشن کا الزام میرے سننے میں نہیں آیا۔اب جج اسکینڈل،مسٹر ٹن پرسنٹ،مسٹر ڈیزل، چائنہ کٹنگ ، ڈاکٹر عاصم ،سینکڑوں داغدار کردار دیکھنے اور پڑھنے کو مل رہے ہیں۔

پھر مردِ ناحق ضیاءالحق نے جہاد افغانستان کے چکر میں امریکہ اور سعودیہ کی اشیر باد سے سارے عالم اسلام کو دھوکہ دیا۔ڈرگ،افیون کلاشنکوف،کو رواج دیا۔علمائے سُو کو سر پر بٹھا کر اقتدار کے محلوں تک پہنچا کر ان کی اہمیت بڑھائی۔مدرسوں کو فنڈز دے کر ایک مجاہدین کی فوج ظفر موج پیدا کر دی۔جس کو ہماری فوج نے پروان چڑھا کر پھر غیر سنجیدہ سوچ کا مظاہرہ کیا،اور ساتھ ہی اس آڑ میں ایٹم بم بنانے کو ترجیح دی۔جبکہ عام آدمی کی صحت و تعلیم،بجلی و پانی اور اس کی بہتری کو نظر انداز کر کے دو فیصد افراد کی ٹیڑھی سوچ کو غالب کر دیا گیا۔بھٹو کو پھانسی دینا،انتہا پسندی،ٹیڑھی سوچ اور غیر سنجیدگی ہی تھی۔پھر اس کی فوج بے نظیر کی جیت پر عوامی ریلے کو تو روک نہ سکی مگر علمائے سُو اور فوج کو عورت کا اقتدار پسند نہ آیا،آئی جے آئی بنا کر اسے تبدیل کر کے کٹھ پتلی نواز شریف کو لایا گیا جو کہ سمندر کے آگے بند باندھنے کے مترادف تھا۔جب اس کی شخصیت متنازعہ ہوئی تو پھر مکرر بے نظیر کو لایا گیا۔آخر کار اکتوبر ۱۹۹۹ء میں خود ہی فوج اقتدار میں آگئی۔جبکہ کارگل کا فیصلے میں بھی نواز شریف نے غیر سنجیدگی دکھائی،اور انڈیا اور امریکہ کی جھولی میں جا گرا۔جب نائن الیون آیا تو یہی فوجی شیر امریکہ کے آگے بھیگی بلی بن گیا۔یہ سب غیر سنجیدہ اور حب الوطنی سے عاری فیصلے تھے۔

ہمارے ملک میں فوج ہی باطنی طور پر مقتدر رہی ہے۔سیاسی لیڈر کی کوئی قدر نہیں۔جب سیاسی لیڈروں نے دیکھا کہ ہمارا مقام ہمیں نہیں ملتا تو انہوں نے لوٹ کھسوٹ کو ترجیح دی۔اسی لئے ہمارے لیڈر سب اَب اُمراء میں شامل ہیں۔ اور حکومت غرب ہے۔سب اداروں کو اندر سے خالی کر دیا گیا۔اور دولت بیرون ممالک پہنچا دی گئی۔ غریب عوام درمیان میں پس رہے ہیں۔ملک کی بنیادوں میں پانی پڑ گیا ہے۔سب فرقے جو مظلوم ہیں ، اقلیتیں جو اِن کے رویئے سے خوف زدہ ہیں۔اور ملک کو چھوڑنے کے درپے ہیں۔انسان کو انسان ، بھائی کو بھائی کھا رہا ہے۔لوٹ کھسوٹ ہماری عادت ثانیہ بن چکی ہے۔ہم کبھی بھی مخلص نہیں رہے،نہ کشمیریوں کے ساتھ،نہ وطن کے ساتھ،نہ دوست کے ساتھ،نہ دشمن کے ساتھ۔ہم غیر سنجیدہ ہیں،اور غیر سنجیدہ ہی رہیں گے۔یہ غیر سنجیدگی نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔اسی لئے ہمارے سارے ادارے فیل ہو چکے ہیں کیونکہ ہر ادارے کا نگران ڈاکو کی طرح اسی ادارے کو لوٹ رہا ہے۔پی آئی اے ،اسٹیل ملز،واپڈا،ریلوے،پی ڈبلیو آر،پبلک ٹرانسپورٹ وغیرہ۔مگر حیرت ہے سب پرائیویٹ ادارے کامیاب ہیں۔ہر کوئی اپنی ذاتی دولت کو بڑھا رہا ہے۔سب حکومتی ذرائع وسائل کو لوٹ رہے ہیں۔۔قومی،ملی مفاد کو تہہ

تیغ کر کے ملک کو قربان کر کے خود کو بچائے جانے پر ساری قوم لگی ہوئی ہے ۔کوئی RAW کا ایجنٹ ہے کوئی سعودیہ کا،کوئی فرنگی کا ،کوئی طالبان کا کوئی القاعدہ کا،خدا کا ایجنٹ کوئی بننے کو تیار نہیں ۔نہ کسی آدمی کو اپنے کردار کی فکر ہے۔نہ اخلاق کی ،نہ اپنے شعائر کی ۔جن لوگوں کو منتخب کیا جاتا ہے۔اگر ان کے کردار اور قول وفعل کو دیکھا جائے اور ملک کے لئے ان کی غیر سنجیدگی ملاحظہ ہوتو انسان کانپ اُٹھتا ہے۔جعلی وزیر،جعلی ڈگری ،جعلی پارٹی ،جعلی پارلیمنٹ،جعلی پیر ،جعلی ڈاکٹر،جعلی علمائے سُو،جعلی جنت و دوزخ، وغیرہ وغیرہ ۔ہم کن کے افکار کا ذکر صبح وشام کرتے ہیں اور ہمارے اعمال کیا ہیں ،اور ہم اپنے وطن عزیز کے لئے کب سنجیدہ ہونگے ۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔خدا تعالیٰ اس ملک پر رحم کرے۔آمین۔

انصار عباسی کے نام

عرفان احمد خان۔فرینکفرٹ

ایک وقت وہ تھا جب پاکستانی معاشرہ نظریاتی اعتبار سے صرف دو حصوں میں تقسیم تھا۔ دینی رُجحان رکھنے والوں کو زیادہ تر دائیں بازو سے منسلک سمجھا جاتا تھا جبکہ لبرل خیالات رکھنے والے بائیں بازو میں شمار کیے جاتے تھے۔پھر ضیاء الحق کی اسلام پسندی نے معاشرہ اس حد تک بگاڑ دیا کہ دائیں بازو سے تعلق رکھنے والوں میں اس قدر دراڑیں پڑ گئیں کہ مسلک کی پہچان کو نمائندگی کا حق دے دیا گیا۔وقت کے ساتھ ساتھ یہ بیماری تحریر وتقریر سے نکل کر لباس کا حصہ بن کر اپنی مخصوص پہچان میں تبدیل ہوگئی۔

اس کے بعد وہ وقت بھی آیا کہ موٹر سائیکلوں اور گھروں کی چھتوں پر اپنے اپنے مسلک کے جھنڈے فخر سے لہرائے جانے لگے۔راہ جاتے مسافر مسجد میں داخل ہونے سے قبل اس امر کی تصدیق کرنے لگ پڑے کہ مسجد دیوبندیوں کی ہے یا یہاں کے امام بریلوی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔وہ تفریق جو صرف دائیں اور بائیں بازو تک محدود تھی اس کی تقسیم در تقسیم نے ہمیں قوم بننے سے محروم رکھا۔ پاکستان میں ایک ایسا معاشرہ تشکیل پا گیا ہے جہاں دوستی سے زیادہ دشمنیوں نے راہ پالی ہے۔

دائیں اور بائیں بازو کی نظریاتی تفریق دنیا کے ہر ملک میں موجود ہے۔یورپ کے جمہوری، ترقی یافتہ معاشرہ میں بھی سیاسی دنگل دائیں اور بائیں بازو کی نظریاتی تفریق پر لڑے جاتے ہیں۔عیسائیت میں بھی فرقوں کی تعداد کچھ کم نہیں لیکن یہاں مذہب کبھی معاشرہ کی ترقی میں حائل نہیں ہوا اور نہ ہی ریاست کے روزمّرہ اُمور میں مذہب کی حاضری کو اتنا ضروری خیال کیا جا رہا ہے۔کیتھولک اور پروٹسٹنٹ چرچز کا رول عبادت اور اخلاقیات کی ترغیب تک محدود ہے۔

ہمارے ہاں دیوبندیوں ، بریلویوں اور شیعہ سنی کی تفریق جس خوں ریزی کا باعث بنی ہوئی ہے اس کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ قومی ایکشن پلان میں سب سے پہلے مذہبی تفرقہ بازی کو ختم کرنے کی طرف توجہ دی جاتی۔جن مذہبی تنظیموں اور ان کے ہمدرد کالم نویسوں نے معاشرہ کو یرغمال بنایا ہوا ہے ان کے خلاف اقدامات اٹھائے جاتے۔چارسدہ یونیورسٹی میں ہونے والی دہشت گردی کے تازہ واقعہ کے بعد یہ بات شدت سے محسوس کی جا رہی ہے کہ قومی ایکشن پلان پر پوری طرح عمل نہیں کیا جا رہا۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ کراچی اور وزیرستان میں کی جانے والی کاروائیوں کے علاوہ قومی ایکشن پلان جمود کا شکار ہے۔جو کام سیاسی حکومتوں کے کرنے کے تھے وہ اس طرف جان بوجھ کر غفلت دکھا رہی ہیں۔ حالانکہ ہم سب متفق ہیں کہ دہشت گردوں نے انتہا پسندوں کی گود میں پرورش پائی ہے اور انتہا پسندی کے خاتمہ کے لیے ان ٹھکانوں کا خاتمہ ضروری ہے جہاں انتہا پسندی کی تعلیم دی جاتی ہے۔وقت کا تقاضہ ہے کہ ریاست کا چہرہ لبرل نظر آنا چاہیے۔لیکن ریاست کو لبرل بنانے کے خلاف دائیں بازو کے انتہا پسند مذہبی تشخص کا پرچار کرنے والے کالم نویس میدان میں موجود رہتے ہیں۔وزیراعظم نے پاکستان کے روشن مستقبل کو لبرل اِزم سے کیا تشبیہ دے دی کہ دائیں بازو کے انتہا پسند کالم نویسوں کی رات کی نیندیں حرام ہوگئیں ہیں۔

یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ پاکستانی معاشرہ کسی طور پر بھی اسلامی معیار پر پورا نہیں اترتا یا اسلام کے اعتبار سے مثالی معاشرہ نہیں ہے ان کا اصرار اپنی جگہ قائم ہے کہ پاکستان اسلامی ریاست ہے اور اس کا اسلامی تشخص برقرار رہنا چاہیئے۔ان کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں کہ بنگلہ دیش سیکولر ملک ہونے کے باوجود اپنا اسلامی تشخص برقرار رکھے ہوئے ہے۔تو پاکستان میں ایسا کیوں نہیں ہوسکتا۔جنگ کے کالم نگار انصار عباسی اسی خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ کئی سال بطور سزا بندش کے بعد یوٹیوب والے اسلام مخالف پراپیگنڈہ سے باز رہیں گے۔حالانکہ موجودہ حالات میں مخالفین سے زیادہ خود مسلمانوں کا کردار اسلام مخالف پراپیگنڈہ کا موجب بن رہا ہے۔جس کی طرف مسلمانوں کی توجہ دلانے کے لیے انصار عباسی کا شرمسار قلم تیار نہیں۔ایک مصدقہ اطلاع کے مطابق سب سے زیادہ فحش ویب سائٹس دیکھنے والے ممالک میں اسلامی جمہوریہ پاکستان بھی شامل ہے جن دنوں یوٹیوب پاکستان میں بند تھی پاکستانی میڈیا کے مطابق چار لاکھ سے زائد غیر اخلاقی ویب سائٹس پاکستان میں دیکھی جا رہی تھیں۔اگر پاکستانی میڈیا کی یہ خبر درست ہے تو پھر انصار عباسی کو انوشہ درحمان کو دی جانے والی مبارک باد واپس لے لینی چاہیے۔

مِٹی دا ’’توں‘‘ مِٹی ہونا۔ کاہدی ’’بلے بلے‘‘
اج مِٹی دے ’’اُتے‘‘ بندیا، کل مِٹی دے ’’تھلے‘‘

عالمی ہائر ایجوکیشن مراکش کی بانی خاتون

فاطمہ الفہری

تحریر: زکریا ورک کینیڈا

کسی بڑی تہذیب کی پہچان تعلیم ہوتی ہے۔کسی معاشرے کا تہذیب یافتہ ہونے کا پتہ اس کی تعلیم سے لگایا جاتا ہے۔فاطمہ الفہری کا نام اس ضمن میں تعلیم کی تاریخ میں نمایاں طور پر ابھر کر آتا ہے جس نے دنیا کا پہلا یونیورسٹی سسٹم شروع کیا تھا۔یہ ایک مسلمان خاتون کا کارنامہ ہے کہ اس نے ہائر ایجوکیشن کا نظام شروع کر کے ڈگریاں دینی شروع کیں۔فاطمہ نے اپنے خاندان کے ہمراہ تیونس سے مراکش کے شہر فاس میں نویں صدی کے شروع میں ہجرت کی تھی جب وہاں بادشاہ ادریس دوم فرماں روا تھا۔بادشاہ نہ صرف غیر معمولی حاکم بلکہ نیک اور پارسا مسلمان بھی تھا۔فاس اس وقت المغرب کا عروس البلاد، ترقی یافتہ شہر تھا۔یہ شہر ۱۹۲۵ء تک مراکش کا دارالخلافہ رہا تھا۔فاس اسلامی دنیا کا اس وقت مذہب اور کلچر کے لحاظ سے کاسموپولٹن شہر تھا۔بادشاہ نے یہ شہر فاس دریا کے بائیں کنارے پر آباد کیا تھا۔فاس میں ہی فاطمہ پروان چڑھی اور شادی کے بعد آباد ہوئی۔اس کے والد محمد بن عبداللہ الفہری کامیاب ترین بزنس مین تھا۔فاطمہ کو کئی دکھوں کا سامنا کرنا پڑا جب اس کے نزدیکی رشتہ دار یعنی اس کا خاوند، باپ اور بھائی یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہو گئے۔فاطمہ اور اس کی بہن مریم کو ورثہ میں کثیر دولت ملی جس سے اس کو مالی آزادی مل گئی۔

دونوں بہنوں چونکہ بذات خود اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں اسلئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی دولت کو تعلیمی و تدریسی ادارے بنانے میں صرف کریں گی، تا کہ ان کی کمیونٹی کو دنیا میں شناخت مل سکے۔فاس شہر کی ایک ضرورت بڑی مسجد تھی تا بڑھتی ہوئی آبادی، نیز اسلامی سپین سے نکالے ہوئے مسلمانوں کیلئے مناسب عبادت گاہ ہو۔مریم نے اس ضمن میں مسجد اندلس ۸۵۹ء میں تعمیر کروائی جبکہ فاطمہ نے قیروائین Qarawiyyin اور مدرسہ تعمیر کروایا۔اور ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ مدرسہ ابھی تک طالب علموں کو زیور علم سے آراستہ کر رہا ہے۔ڈگری دینے کا یہ سب سے پرانا تعلیمی ادارہ ہے۔ فاطمہ نے قرآن، دینیات، فقہ، خطابت، انشاء پردازی، منطق، گرائمر، تاریخ اسلام، جغرافیہ، طب، فلکیات، کیمیا، علم الحساب اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی تھی۔وہ ایک نوجوان، پرعزم، نیک دل اور مختلف علوم میں تعلیم یافتہ تھی جو کہ تاریخ اسلام میں شاذ ہی ایسا ہوا ہے کہ عورت ہو تو اتنے علوم میں تعلیم یافتہ ہو۔اس کو تمام دولت وراثت میں اپنے باپ سے ملی تھی جو اس نے ایک عالی شان مسجد اور مدرسہ کی تعمیر میں صرف کر دی۔یہ پرشوکت عمارت ۸۵۹ء میں مکمل ہوئی اور جلد ہی مراکش کی اعلیٰ درجے کی یونیورسٹی بن گئی۔فاطمہ کی بہن مریم نے ورثہ میں ملنے والی کثیر دولت مراکش کے شہر فاس میں مسجد اندلس تعمیر کرنے میں صرف کی تھی۔

جامعہ القرویین کا آغاز مسجد کے طور پر ہوا مگر جلد ہی اس میں اسلامی علوم کی تعلیم کا کام شروع کر دیا گیا۔یہاں سیاسی حالات و واقعات پر بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔یونیورسٹی میں عمدہ آلات تھے خاص طور پر ہیئت کے آلات جیسے اصطرلاب، ریتی گھڑیاں، سن ڈائیل، اور وقت معلوم کرنے کے دیگر آلات۔شروع میں یہاں کا نصاب دینی علوم (قرآن، فقہ، گرائمر، منطق) پر مشتمل تھا مگر بعد میں تاریخ، طب، جغرافیہ، کیمیا اور ریاضی کی تعلیم نصاب میں شامل کر دی گئی۔مسجد کا کورٹ یارڈ نیلے اور سفید ٹائیلوں سے مزین مغرب میں ہے۔یہاں سنگ مرمر سے بنے تین فوارے بھی ہیں۔مرکزی فوارہ بارھویں صدی سے چلا آ رہا ہے۔مسجد کی تعمیر کا مقصد نہ صرف عبادت کیلئے جگہ بلکہ شہر کی آبادی کیلئے تعلیمی درسگاہ مہیا کرنا تھا۔

جامعہ القرویین نے اسلامی دنیا اور یورپ کے درمیان کلچرل اور تعلیمی تعلقات قائم استوار کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ممتاز جغرافیہ دان محمد الادریسی (وفات ۱۱۶۶ء) کے نقشوں نے یورپ کی اقوام کو احیائے علوم کے دور میں فتوحات میں مدد دی تھی، ایک دور میں وہ فاس میں مقیم رہا تھا۔پھر عہد وسطیٰ کا بے مثال عالم حسن ابن محمد الوزان الفاسی (Leo Africanus–1449 1554) فاس کا شہری تھا جس کی کتاب ڈسکرپشن آف افریقہ، نارتھ افریقہ کی جیوگرافی اور سیاست پر حرف آخر تھی۔

اسلامی ممالک کی دیگر جامعات کی طرح نہ صرف یہاں مقامی طالب علم تعلیم سے بہرہ ور ہوتے بلکہ ہمسایہ ممالک سے بھی طلباء یہاں آتے تھے۔یونیورسٹی کی عالمی شہرت کے پیش نظر یہاں افریقہ، یورپ سے سکالر تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔یہاں تعلیم حاصل کرنے والوں میں ممتاز نام قرطبہ کا موسیٰ ابن میمون 1135–1204 کا ہے جو عہد وسطیٰ جلیل القدر یہودی فلاسفر، طبیب، مصنف اور ہیئت دان تھا۔دلالۃ الحائرین اس کی معروف کتاب ہے۔قرطبہ میں اس کا مجسمہ راقم نے ۱۹۹۹ء میں دیکھا تھا۔فاس میں اس کا گھر ابھی تک قائم ہے۔دوسرا ممتاز شخص جغرافیہ دان محمد الادریسی (وفات ۱۱۶۶ء) تھا جس کے نقشوں نے یورپ کی اقوام کو احیائے علوم کے دور میں فتوحات میں مدد دی تھی، ایک دور میں وہ فاس میں مقیم رہا تھا۔پھر عہد وسطیٰ کا بے مثال عالم حسن ابن محمد الوزان الفاسی (Leo 1449–1554 Africanus) فاس کا شہری تھا جس کی کتاب ڈسکرپشن آف افریقہ، نارتھ افریقہ کی جیوگرافی اور سیاست پر حرف آخر تھی۔ اس کے علاوہ اہم شخصیات روشید السبطی (۱۳۲۱)، محمد ابن الحاج الابداری (۱۳۳۶)، اور عمران الفاسی (۱۰۱۵)، ابوالعباس الزواوی، ابو مذہب الفاسی (مالکی فقہ کا نظریہ کار)۔اس کے علاوہ ابن العربی، ابن خلدون، اور اسٹرانومر نورالدین البطر وجی بھی اس جامعہ سے منسلک رہے تھے۔

غیر مسلم طلباء کا بھی یہاں خیر مقدم کیا جاتا تھا۔غیر ملکی طلباء میں سے یہاں کا نامور

گریجوایٹ فرانس کا Gerber of Auvergned1003 تھا جو بعد میں پوپ سلوسٹر دوم بنا تھا۔ اس نے عربی ہندسے یورپ میں متعارف کرائے تھے۔ جامعہ القرویین میں ۱۳۴۹ء میں لائبریری کی بنیاد رکھی گئی جو دنیا کی پرانی اور اہم ترین لائبریری ہے۔ یہاں کے پرانے مسودات میں موطا امام مالک کی کئی جلدیں ہیں جو ہرن کی کھال پر لکھی ہوئی ہیں۔

جیسا کہ بیان کیا گیا جامعہ القرویین پہلی ڈگری دینے والی یونیورسٹی تھی۔ اس کے بعد جلد ہی دیگر اسلامی شہروں میں جامعات قائم ہوگئیں۔ قاہرہ کی جامعہ الازہر کی بنیاد ۹۷۰ میں رکھی گئی تھی۔ سلجوق حکمرانوں نے ۱۰۰۰ کے سال مشرق وسطیٰ میں متعدد شہروں میں مدرسے قائم کئے۔ ڈگریاں دینے کا سلسلہ جلد ہی اسلامی سپین کے راستے یورپ پہنچ گیا، جہاں یورپین طالبعلم تعلیم کیلئے آیا کرتے تھے۔ اٹلی کی یونیورسٹی آف بولونیا اور آکسفورڈ کی بنیاد گیارھویں اور بارھویں صدی میں رکھی گئی، یہاں انہوں نے جامعہ القرویین کی روایت کو برقرار رکھا اور تعلیم مکمل ہونے پر طلباء کو ڈگریاں دی جاتی تھیں۔ کسی مضمون میں طالب علم کی کوالیفی کیشن کا فیصلہ اس ڈگری سے ہوتا تھا۔

بغداد کی یونیورسٹی میں شام، ایران، ہندوستان سے آئے ہوئے طلباء کو طب، علم الادویہ، علم ہیئت اور نیچرل سائنسز کے زیور سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ قاہرہ کی جامعہ الازہر کا ایک جلیل القدر سائنسدان ابوالحسن ابن الہیثم تھا۔ ابن خلدون بھی یہاں پروفیسر رہا تھا۔ افریقہ کی ملک مالی کی سنکور یونیورسٹی جس کی بنیاد ۹۸۹ میں رکھی گئی تھی یہاں ۱۲ صدی میں پچیس ہزار طلباء تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اسلامی یونیورسٹیوں کی سب سے اعلیٰ ڈگری پی ایچ ڈی کے برابر تھی جس کے حصول میں دس سال کا عرصہ درکار ہوتا تھا۔ اس ڈگری کے مقالہ کو رسالے یا مکتوب کہا جاتا تھا اور جن طلباء کو یہ ڈگری دی جاتی تھی ان کو آیت اللہ کہا جاتا تھا۔ جیسے ہمارے دور میں پی ایچ ڈی حاصل کرنے والے کو ڈاکٹر کہا جاتا ہے۔ ہمارے دور میں یونیورسٹیوں میں چیئر Chair قائم کی جاتی ہیں جن کیلئے مخصوص رقم مختص ہوتی ہے یہ نظام بھی اسلامی دنیا سے آیا تھا کیونکہ مسجد میں استاد کرسی پر بیٹھ کر درس دیتا اور طلباء فرش پر حلقہ بنا کر بیٹھے ہوتے تھے۔ جامعات سے گریجوایٹ ہونے والے خاص قسم کی پگڑی سر پر پہنتے تھے اسی کی نقل میں یورپ میں سر پر کا نوکیشن والے روز ہیٹ پہنا جاتا ہے۔

بڑا عشق عشق توں کرناں اے
کدی عشق دا گنجل ۔۔ کھول تے سہی
تینوں مٹی وچ نہ رول دیوے
دو پیار دے بول ۔۔ بول تے سہی
سکھ گھٹ تے درد ہزار ملن
کدی عشق نوں کڑی ۔۔ تول تے سہی
تیری ہسدی اکھ وی مجھ جاوے
کدی سانوں اندروں ۔۔ پھول تے سہی

وارث شاہ

شخصیات

ایس ایس پی چوہدری اسلم شہید

سید حسن خان

9 جنوری کو سی آئی ڈی کے ایس ایس پی چوہدری اسلم شہید کی دوسری برسی ہے۔ چوہدری اسلم 10 اپریل 1963ء میں مانسہرہ کے علاقے ڈھوڈھیال میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد کراچی منتقل ہو گئے۔ یہیں سے گریجویشن کرنے کے بعد پولیس فورس میں شمولیت اختیار کر لی۔ اے ایس آئی سے ترقی کرتے کرتے وہ سی آئی ڈی کراچی میں ایس ایس پی کے عہدے تک پہنچے۔ چوہدری اسلم ایک بہادر اور نڈر پولیس افسر تھے۔ وہ طالبان اور شدت پسندوں کے خلاف بے شمار کاروائیوں میں شامل رہے اور اسی لیے طالبان انہیں اپنے ...لیے بہت بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ ان پر پہلے بھی کئی جان لیوا حملے ہوئے لیکن وہ ہمیشہ بچ نکلے۔ 9 جنوری 2014ء کی شام اپنے دفتر سے گھر جاتے ہوئے لیاری ایکسپریس وے پر ان کی گاڑی پر دہشت گردوں نے باقاعدہ ریکی کر کے بائیں جانب سے حملہ کیا۔ حملے میں ان کی گاڑی مکمل طور پر تباہ ہوگئی اور چوہدری اسلم کے علاوہ ان کے محافظ اور ڈرائیور بھی حملے میں جاں بحق ہو گئے۔ شہید چوہدری اسلم کی بیوہ کے مطابق شہید چوہدری اسلم نے گھر والوں کو بہت کم وقت دیا۔ شعر و شاعری سے بھی شغف تھا۔ پولیس کی وردی کے علاوہ چوہدری اسلم عموماً سفید کاٹن کے کلف شدہ کپڑوں میں نظر آتے۔ ان کی بیوہ نے بتایا کہ چوہدری اسلم کو ہمیشہ شہادت کی تمنا رہی اور وہ اسے کفن سمجھ کر پہنا کرتے تھے، چاہے کوئی آپریشن ہو یا عام حالات انہوں نے کبھی بھی بلٹ پروف جیکٹ یا ہیلمٹ نہیں پہنا تھا۔

''باقی صدیقی''

شیراز وحید خان

8 جنوری اردو اور پنجابی کے معروف شاعر اور ادیب "باقی صدیقی" کا یومِ وفات ہے۔ باقی صدیقی اردو اور پنجابی کے شاعر تھے۔ باقی صدیقی کا اصل نام محمد افضل قریشی تھا۔ روالپنڈی کے نواحی گاؤں ہسام میں 20 دسمبر 1908 کو پیدا ہوئے۔ میٹرک پاس کر کے گاؤں کے مدرسہ میں مدرس ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد راولپنڈی آ گئے۔ سترہ برس ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے اور بے شمار پوٹھوہاری گیت لکھے۔ اُردو کلام کے چار مجموعے۔ جام جم، دارورسن، زخم بہار اور بارِ سفر شائع ہو چکے ہیں۔ کچے گھڑے پوٹھوہاری گیتوں کا ...مجموعہ ہے۔ 8 جنوری 1972ء کو باقی صدیقی انتقال کر گئے وہ راولپنڈی میں قبرستان قریشیاں، سہام میں آسودۂ خاک ہیں۔

زمین۔ فراز حمید خان

زمین اپنے محور کے گرد ایک تیس کلومیٹر/سیکنڈ سے زائد کی رفتار سے گھوم رہی ہے۔ تاہم اس وقت کیا ہوگا جب وہ اچانک رُک جائے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ہوا تو اس کے اثرات تباہ کن ہوں گے۔ ایک رپورٹ کے مطابق اگر زمین کا گھومنا اچانک تھم جائے تو ہر وہ چیز جو کسی چیز سے بندھی ہوئی نہیں ہوئی اچانک مشرق کی جانب ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑنے لگے گی۔ اس کے اثرات فضاء پر بھی مرتب ہوں گے اور ہوائیں اتنی طاقتور ہو جائیں گی جیسے کسی ایٹم بم کے دھماکے کے بعد ہو سکتی ہیں۔ زمین کی حرکت رُک جانے سے سمندروں میں بہت بڑی سونامی لہریں پیدا ہوں گی جو ایک منٹ کے اندر 17 میل کے رقبے کو غرق کر سکیں گی۔ زمین کا ایک دن چوبیس گھنٹوں کی بجائے موجودہ 365 دنوں کے برابر لمبا ہو جائے گا جس دوران چھ ماہ تک سورج آگ برساتا رہے گا جس کے بعد چھ ماہ کی طویل رات کے دوران ہڈیاں جما دینے والی سردی کا سامنا ہوگا۔ زمین کی حرکت تھم جانے کے نتیجے میں سورج بھی مغرب سے طلوع اور مشرق میں غروب ہوگا اور ایسا سال میں ایک دفعہ ہی ہو سکے گا۔ زمین کے گھومنے سے مرکز گریز طاقت پیدا ہوتی ہے جو زمین کی موجودہ شکل کو برقرار رکھنے کا کام کرتی ہے، تاہم جب زمین رُک جائے گی تو سمندر دونوں قطبین کی جانب منتقل ہو جائیں گے جہاں کشش ثقل طاقتور ہوگی۔ اس کے نتیجے میں دو طاقتور سمندر ایک بہت بڑا براعظم زمین کے درمیان اُبھر آئے گا۔ مقناطیسی فیلڈ کی طاقت بتدریج کم ہونے لگے گی جس کے نتیجے میں زمین جان لیوا کاسمک شعاعوں کی زد میں آجائے گی جس کے نتیجے میں یہاں زندگی کی بقاء کا امکان لگ بھگ نہ ہونے کے برابر ہوگا۔

ممتاز گیت نگار صہبائی۔ بلال افتخار

8 جنوری کو اُردو کے ممتاز گیت نگار شاعر نگار صہبائی کا یومِ وفات ہے۔ نگار صہبائی کا اصل نام محمد سعید تھا اور وہ 7 اگست 1926ء کو ناگ پور میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم مدراس اور ناگ پور سے حاصل کی۔ 1947ء میں وہ پاکستان آ گئے جہاں انہوں نے جامعہ کراچی سے گریجویشن کیا۔ انہوں نے شاعری کی تربیت اپنے ماموں عبدالوہاب سے حاصل کی۔ ابتدا میں انہوں نے شاعری کے علاوہ افسانے بھی لکھے اور انہیں مصوری، موسیقی اور رقص کا شوق بھی رہا۔ انہوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی مگر ان کی محبوب صنف سخن گیت نگاری تھی جس میں وہ ایک منفرد اسلوب کے مالک تھے۔ ان کے گیتوں کے تین مجموعے جیون درپن، من گاگر اور انت سے آگے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ 8 جنوری 2004ء کو نگار صہبائی کراچی میں وفات پا گئے۔

نواب صدیق علی خان

9 جنوری 1974ء کو پاکستان کی جدوجہد آزادی کے معروف رہنما نواب صدیق علی خان کراچی میں وفات پا گئے۔ نواب صدیق علی خان 1900ء میں ناگ پور میں نواب غلام محی الدین خان کے گھر پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم بھی ناگ پور ہی میں حاصل کی۔ 1935ء میں ناگ پور ہی سے مرکزی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ پاکستان کے پہلے وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خان کے پولیٹیکل سیکریٹری مقرر ہوئے۔ 16 اکتوبر 1951ء کو نواب زادہ لیاقت علی خان نے آپ ہی کے ہاتھوں میں دم توڑا تھا۔... نواب صدیق علی خان خواجہ ناظم الدین، محمد علی بوگرہ اور حسین شہید سہروردی کے پولیٹیکل سیکریٹری رہے اور 1958ء میں سے 1961ء تک ایتھوپیا میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ نواب صدیق علی خان نے نوابزادہ لیاقت علی خان کی سوانح بے تیغ سپاہی کے نام سے تحریر کی تھی۔ وہ کراچی میں عالمگیر روڈ پر جامع مسجد 'سی پی اینڈ برار ہاؤسنگ سوسائٹی کے احاطے میں آسودہ خاک ہیں۔

معروف اداکار سلطان راہی۔ فضل عمر ڈوگر

9 جنوری 1996ء کی رات ملک کے معروف اداکار سلطان راہی کو ڈاکوؤں نے فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا تھا۔ سلطان راہی کا اصل نام سلطان محمد تھا۔ انہوں نے اپنی فلمی زندگی کا آغاز فلم باغی میں ایک معمولی سے کردار سے کیا تھا اس کے بعد وہ خاصے عرصے تک فلموں میں چھوٹے موٹے کردار ہی ادا کرتے رہے۔ 1971ء میں فلم بابل میں انہیں ایک اہم کردار دیا گیا جس سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا اور پھر انہوں نے پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پاکستان کے فلمی صنعت کے سب سے مقبول اور سب سے مصروف اداکار بن گئے۔ انہوں نے مجموعی طور پر 804 فلموں میں کام کیا جن میں 500 سے زیادہ فلمیں پنجابی زبان میں اور 160 فلمیں اردو زبان میں بنائی گئی تھیں جبکہ 50 سے زیادہ فلمیں ڈبل وژن تھیں ان میں سے 430 فلمیں ایسی تھیں جن کے ٹائٹل رول سلطان راہی نے ادا کئے تھے۔ ان کی مشہور فلموں میں بشیرا، شیر خان، مولا جٹ، سالا صاحب، چن وریام، آخری جنگ اور شعلے کے نام سرفہرست ہیں۔ وہ ایک مخیر شخص تھے اور انہوں نے اپنے ذاتی خرچ پر کئی مساجد بھی تعمیر کروائی تھیں۔ 14 جنوری 1996ء کو انہیں لاہور میں شاہ شمس قادری کے مزار کے احاطے میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

ممتاز شاعر اور صحافی ڈاکٹر آذر تمنا

عبالقدیر کوکب

9 جنوری اردو کے ممتاز شاعر اور صحافی ڈاکٹر آذر تمنا کا یومِ ولادت ہے۔ ڈاکٹر آذر تمنا 9 جنوری 1954ء کو لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد جناب فضل الٰہی تمنا بھی خوش گو شاعر تھے اور ان کے چھوٹے بھائی یشب تمنا بھی نئی نسل کے ممتاز شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر آذر تمنا نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ستر کی دہائی میں لاہور سے کیا۔ وہ مختلف اخبارات سے بھی وابستہ رہے۔ انہوں نے سید قاسم محمود کے ادارے شاہکار سے شائع ہونے والے کئی علمی سلسلوں کی ادارت بھی کی۔ اسی کی دہائی میں انھوں نے کچھ وقت کراچی میں بھی گزارا، پھر وہ اسلام آباد منتقل ہو گئے۔ نوے کی دہائی میں وہ آسٹریلیا چلے گئے تھے جہاں انہوں نے بین الاقوامی تعلقات میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ گزشتہ چند برس سے وہ اسلام آباد میں مقیم تھے اور سینٹر فار سیکیورٹی اینڈ پیس اسٹڈیز اسلام آباد سے بطور صدر منسلک تھے۔ یکم مارچ 2014ء کو انہیں دل کا دورہ پڑا جس میں وہ جانبر نہ ہو سکے۔ انہیں اسلام آباد میں سپردِ خاک کیا گیا۔

خواجہ ریاض الدین عطش - اعزاز لطیف خان

8 جنوری مشہور شاعر اور ادیب خواجہ ریاض الدین عطش کا یومِ وفات ہے۔ عطش 4 مارچ 1925ء کو پٹنہ کے قریب واقع تاریخی شہر عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنا بچپن عظیم آباد میں گزارا، پھر پٹنہ سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دوسری جنگِ عظیم کے دوران برٹش ایئر فورس میں شمولیت اختیار کی اور پانچ برس اس سے وابستہ رہے۔ اسکے بعد عطش ڈھاکہ چلے گئے۔ عطش کا تعلق ایک ادبی گھرانے سے تھا۔ انہوں نے کم عمری میں ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ ڈھاکہ میں انہوں نے فلموں کے لئے گیت بھی لکھے۔ وہ 1971 تک مشرقی پاکستان میں ہی مقیم رہے، لیکن بنگلہ دیش بننے کے بعد انہوں نے ایک بار پھر ہجرت کی اور پاکستان آ گئے۔

انہوں نے کچھ عرصہ لاہور میں واپڈا میں ملازمت کی اور بعد ازاں سعودی عرب چلے گئے۔ 1983 میں وہ واپس پاکستان آ گئے۔ اردو شاعری میں عطش کا اپنا ایک منفرد انداز تھا جسے ادبی حلقوں اور عوام دونوں میں بیحد پسند کیا گیا۔ ان کی شاعری کی تین کتابیں ہیں۔ سوغاتِ جنون انکی غزلیات کا مجموعہ ہے، جشنِ جنون انکی نظموں کا جبکہ وردِ نفس عطش کی حمد و نعت کا مجموعہ ہے۔ انکی دوسری کتابوں میں 'داغ کا آخری چراغ'، ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کی سوانح حیات ہے۔ اسکے علاوہ 'اردو کا شجرہ نسب'، 'اردو ہزار داستان' اور 'اردو دشمن تحریک کے سو سال' بھی انکی کتب ہیں۔ عطش نے ڈھاکہ، کراچی اور شکاگو میں بزمِ سخن کی بنیاد بھی رکھی۔ عطش نے اپنی زندگی کے آخری دس برس شکاگو میں بسر کیے جہاں وہ ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئے۔ شکاگو میں عطش بہت باقاعدگی کے ساتھ ادبی کانفرنسوں اور مشاعروں میں شامل ہوتے رہے۔ اسکے علاوہ وہاں اردو اخبارات اور رسائل میں لکھتے بھی رہے۔ عطش نے اپنی ادبی خدمات پر 'غالب ایوارڈ' سمیت کئی ایوارڈ حاصل کیے۔ عطش 8 جنوری 2001ء کو شکاگو میں انتقال کر گئے اور وہیں آسودہ خاک ہوئے۔

منٹو کے افسانے - مظفر احمد مظفر

ایک رُخ یہ بھی ہے:

منٹو کی ایک چھوٹی سی کہانی ہے ''مسٹیک'' قاتل مردہ شخص کی پتلون اُتارتے ہیں اور ایک چیخ گونجتی ہے۔ مسٹیک ہو گیا! مگر مسٹیک کہاں ہوا ایک نظام بدلا۔ دوسرا نظام آ گیا۔ منظر ذرا سا بدلا ہے۔ ''چودھری برکت حسین آنکھوں میں جگہ گھیرتے ہیں اب تم بھی خطرے میں ہو بالمکند شرما جوش؟'' ''کیوں؟'' ''تمہارے نام کے ساتھ جوش لگا ہے آدھے مسلمان وہ ہنسنا چاہتے ہیں۔ میاں ایسا ہوا تو ازار بند کھول کر... '' کھولیں گے تب بھی فرق نہیں پڑے گا انہیں'' برکت حسین کی آنکھوں میں نمی لہراتی ہے کیونکہ اب ہمارے بعد تم ہو تم جیسے سیکولر سوچنے والے۔ اب وہ چن چن کر تمہیں ختم کر دیں گے تم جہاں کہیں بھی ہو گے تمہیں تلاش کریں گے اور ختم کریں گے۔ ناول 'بیان' سے سیکولر سوچ سامنے تو آ رہی ہے مگر اس طرح نہیں جس طرح سے آنی چاہیے جب مذہب کا کوئی دقیق مسئلہ سامنے آتا ہے تو ادیب کے اندر کا مذہبی انسان بھی پریشان ہو اُٹھتا ہے نہیں؟ ہم ایک لمحہ میں ہندو اور مسلمان بن جاتے ہیں کہانیوں کی سطح پر بھی اندر کا آدمی سامنے آ جاتا ہے نہیں اسے نہیں آنا چاہیے مگر یہی نہیں ہوتا اندر باہر کی جنگ چلتی رہتی ہے باہر کی میز پر بیٹھا ہوا چار لوگوں سے گھرا ہوا آدمی وہ نہیں ہوتا جو گھر کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد ہوتا ہے اپنے گھر میں اپنے بچوں میں۔ لگتا ہے مذہب کی تعریف کو ہم نے کبھی سنجیدہ نہیں لیا۔ ہم بڑی بڑی باتیں کرنے کے درمیان ایک گند چھری سے اُسے حلال کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں مگر حقیقت دیکھا جائے تو مذہبی تعصّبات کا پرندہ اندر بیٹھا ہوتا ہے پاؤں پسارے اور یہ مذہب وہ نہیں ہوتا جو برابری اور مساوات کے سبق سارے عالم کو پڑھا رہا ہوتا ہے۔ فرقہ واریت نے جس مذہب کو جنم دیا وہ تنگ نظری بھی ہے اور اس کا دائرہ محدود بھی ہے۔ سچائی یہ ہے کہ اب مذہب کی نئی تعریف ڈھونڈنی ہوگی۔

تقسیم منصف کی حدیں:

'یارامان اللہ! طوطا کہاں گیا؟'' ''اُڑ گیا'' ''کیسے؟'' ''کھڑکی کھلی رہ گئی اُڑ گیا۔'' ''کوئی دوسرا طوطا مٹھو کی جگہ نہیں لے سکتا'' ''نہیں یار'' ''کیوں'' ''میں نے بتایا نا کہ قریب والے امرود کے پیڑ پر طوطوں کی ڈاریں بہت اُترتی ہیں۔کیا پتا کسی دن ڈار کے ساتھ وہ بھی چلا آئے۔پنجرے کو دیکھے تو شاید اُسے اپنا چھوڑا ہوا گھر یاد آجائے'' خالی پنجرہ (انتظار حسین) پتہ نہیں امرود کے پیڑ پر طوطوں کی ڈاریں اب آتی بھی ہیں یا نہیں مگر اس پنجرے کی یاد باقی رہ جاتی ہے۔بٹوارہ ایک دردناک حادثہ تھا۔ آزادی کے بعد کے 62 برسوں میں سرخ حاشیے گزرنے والی زیادہ تر کہانیاں بٹوارے کی کوکھ سے ہی جنم لیتی ہیں۔یہ درد پاکستانی مصنفوں کا بھی درد بنا، جو اپنا اپنا پنجرہ اپنا نشیمن اُجاڑ کر یا چھوڑ کر پاکستان جا بسے تھے پھر لوٹ کر نہیں آئے یا نہیں آسکے مگر یہاں کی یادیں انہیں خون کے آنسوں رُلاتی رہیں۔کیا پتہ کیس دن ڈار کے ساتھ وہ بھی چلا آئے پنجرے کو دیکھ کر شاید اپنا چھوڑا ہوا گھر یاد آجائے۔تقسیم کی ان خاموش کراہوں کو انتظار حسین کے افسانے میں بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے لیکن ایسا نہیں کہ ہندوستان کے کہانی کاروں میں، خاص کر آزادی کے بعد آنکھیں کھلنے والے کہانی کاروں میں اس جذبہ کا فقدان رہا تقسیم سب کے لئے ناسور رہا خاص طور پر نئی نسل اور نئے کہانی کاروں نے جس مضبوطی کے ساتھ اسے نامنظور کیا، یہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔

فسادات کا مرکزی رول:

اردو افسانوں میں فسادات کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے جہاں تک میرا خیال ہے فسادات پر جتنی کہانیاں اردو میں لکھی گئی ہیں کسی دوسری زبان میں نہیں۔آپ چاہے اس کی جو بھی وجہ تلاش کریں لیکن اس کی ایک وجہ عدم تحفظ کے احساس سے بھی گذرتی ہے۔یہ احساس جب بھی جیسے بھی جن جن وجوہات سے پیدا ہوتی ہے اس زبان کے مصنفوں نے کہانیوں کا انبار لگا دیا۔یہ سچ ہے کہ تقسیم کے وقت فسادات کے وقت اردو زبان میں جو کہانیاں لکھی گئی ہیں اُن میں زیادہ تر کہانیاں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں واضح طور پر آج کے دور کا صحیح عکس ملتا ہے وہ بے رحم سچائیاں احساس کے گوشت میں چبھنے والی کسک، سیاست کے ناپاک اشارے پر تقسیم ہوئی آنکھوں کے ناسور، رتھریا تر اکلچر، اور دوغلے پن کا مزاج کل ملا کر حالات کا جائزہ لیں تو فسادات جیسے اب ملک کا مستقل موسم بن چکا ہے۔ہیمنگوے نے کہا تھا اس کے نزدیک جنگ سے برا کوئی غور طلب مسئلہ نہیں سب سے زیادہ دلچسپ موضوع جنگ ہے یہ حقیقت ہے کہ جنگ کے موضوع پر غیر ملکی زبانوں میں کئی کئی شاہکاروں نے جنم لیا مگر یہاں یہی بات ہم اردو کے افسانوں کے تعلق سے کہہ سکتے ہیں۔

بدلتا منظر نامہ

وقت بدلا بدلتے ہوئے عکس کا اردو کہانیوں میں بھی نظر آیا مگر بدلتے وقت کے ساتھ یہ اردو کہانیاں اپنی زمین سے جڑ نہ سکیں زمین کے مسئلوں سے جڑ نہ سکیں زیادہ تر نئے اردو لکھنے والے ہندی میں چلے گئے۔کچھ برس قبل مجھے ایک دلچسپ خط ملا کہانی کار زیب اختر کا اُس نے اردو میں نہ لکھنے کی وجہ یہ بتائی۔'' اردو کو میں نظر انداز نہیں کرتا۔مگر ان کا مزاج میری سمجھ سے باہر ہے ان کو رومانیت چاہیے چاہے وہ الفاظ کی کیوں نہ ہو موضوع کی ہو یا ٹریٹمنٹ کی ایک خاص دائرہ ہے بس یہیں تک محدود ہے اردو ادب ان کے ادب کو ایک عام آدمی سے کچھ بھی لینا دینا نہیں یہ بڑے صاف ستھرے لوگ ہیں نماز پڑھتے ہیں شراب پیتے ہیں اور تسلیمہ نسرین کو گالیاں دیتے ہیں۔'' اسے محض ایک اردو تخلیق کار کی جھلاہٹ نہیں کہا جا سکتا۔اردو کہانیاں ابھی بھی سمٹی اور سکڑی ہوئی ہیں اس کا انداز اس بات سے بھی لگایا کا سکتا ہے زیادہ تر اردو کہانیاں مسلم معاشرے اور مسلم کردار سے آگے نہیں بڑھی ہیں اس لئے زیب اختر جیسے سمجھ دار ادیب اس ٹوپی تہذیب سے منکر ہوتے ہوئے فرار حاصل کر جاتے ہیں ایک مثال اور بھی ہے جسے بریلی شہر کی ایک مسلم خاتون قاری نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا۔آپ ہندوؤں کو لے کر افسانے کیوں نہیں لکھتے؟ مسلمانوں کو لے کر کیوں؟'' مجھے لگتا ہے کہ آزادی کے آس پاس جو کہانیاں لکھی گئیں وہ بہت پُرزور تھیں۔آج پہلے کی نسبت ہم لوگوں میں مذہبی تنگ نظری زیادہ آگئی ہے۔ہم ایک خاص دائرہ میں بندھ گئے ہیں بس اس سے آگے نہیں۔جیسے بابری مسجد کو لے کر اردو میں بہت کچھ لکھا گیا فسادات اور مذہبی دنگوں پر بہت کچھ لکھا گیا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اردو مصنف ایسے موقعوں پر مجھے زیادہ بیدار نظر آتے ہیں۔ایسے موقعوں پر وہ زیادہ اپنی زمین سے جڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

1 تقسیم ہند کے دوران جو کہانیاں لکھی گئیں کیا ان میں مذہبی تنگ نظری شامل نہیں تھی؟

۲۔ہمارے یہاں مذہبی تنگ نظری کیا بابری مسجد یا گودھرا کے بعد ابھری ہے؟

۳۔اردو مصنف، زمین سے مطلب کیا اپنے مسائل سے لیتے ہیں؟ دیکھا جائے تو یہ بہت الجھے ہوئے سوالات ہیں جن پر کم وبیش ایک ساتھ اتفاق کرنا یا نہ کرنے کی گنجائش بھی کم نظر آتی ہے۔تقسیم ہند کے دوران لکھی جانے والی کہانیوں میں مذہبی تنگ نظری ضرورت سے زیادہ تھی۔آپ مشہور ہندی افسانہ نگار بھیشم ساہنی کی بھائی ادکار بلراج ساہنی کا'' پاکستان کا سفر نامہ'' پڑھ لیجیے کرشن چندر کی پشاور ایکس پریس اور اس طرح کی بہت ساری کہانیاں ہیں جن کو پڑھتے ہوئے ایک خاص طرح کا تعصب آپ کو صاف صاف نظر آجائے گا۔کم وبیش یہی بات مسلم رائٹر کے ساتھ بھی ہے۔وہاں

ہندوؤں کے لئے تحریر میں ایک ظالمانہ تعصب برتا گیا ہے۔ کیوں؟ وجہ بہت معمولی سائیکی ہے۔

(1) جن کی آنکھوں کے سامنے ان کے رشتہ دار عزیز مارے گئے تھے اور جنہوں نے نفرت کے ننگے کھیل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، ان کا بددل ہونا یا نفرت محسوس کرنا کوئی بری بات نہیں سمجھی جائے گی۔

(2) ان ادیبوں نے وہی کیا کہانی میں ایماندار بنتے بنتے بھی وہ رنگ غالب آ گیا۔ یعنی جو شخص اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا مثال کے لئے پیشاور ایکس پریس۔

(3) جو بہت ایماندار بنے مثال کے لئے راما نند ساگر ''اور انسان مر گیا'' اپنی تحریر کو سیکولر رکھنے والا یہ آدمی آخری دنوں میں مذہبی بن گیا رامین سیریل کی تعمیر کے دوران یہ ہندو سنتھاؤں کے لئے کام بھی کرنے لگے۔ یہ میرا نظریہ ہے کہ تقسیم کے بعد ہم آہستہ آہستہ پرانے زخموں کو بھولنے کی کوشش کرتے رہے۔ اور ایک حد تک ہم اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئے تھے۔ بابری مسجد سانحہ سے قبل تک ہماری تحریروں میں کبھی مسلم رنگ غالب نہ تھا لیکن اگر یہ رنگ دوبارہ واپس آیا ہے اور وہ بھی صرف مسلم رائٹر کے حصہ میں تو یہ افسوس کا نہیں سوچنے کا مقام ہے کیونکہ یہ رائٹر اسی بیس سے پچیس کروڑ آبادی کا ذمہ دار فرد ہے، جسے اتنی بڑی آبادی کے باوجود اقلیت کے نام سے پکارا جاتا ہے، اگر یہ اقلیتی منصف صرف اگر صرف اپنے موضوعات کا انتخاب کرتا ہے تو یہ ایک تکلیف دہ بات یوں ہے کہ اس میں ایک پورے قوم کی بے بسی اور لاچاری شامل ہے یعنی آزادی کے بعد برسوں میں آپ نے اتنی بڑی آبادی کو اقلیت بنا دیا۔ آپ نے اس ایک قوم کو اتنے سارے مسائل دے دئے کہ وہ دوسرے زمین سے وابستہ مسائل پر کھنا بھول گیا حسین الحق اور ذوقی کی زیادہ تر کہانیوں او ناولوں میں اشرف کے سہمے ہوئے '' آدمی''، میں غضنفر کی کہانی ختنہ میں طارق چھتاری، سلام بن رازق تک کہانیوں میں بار بار یہ سما ہوا مسلمان نظر آ ہی جاتا ہے۔

کچیلی زمین کا ادب:

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہماری تہذیب کی زمین کچیلی اور نرم ہے ہم چاہے انکار کرنے کی ہمت کرتے ہوں سیمیناروں میں سبھاؤں میں ادبی نشستوں میں، جن وادی دوستوں میں مگر ایک شخص ان سے الگ یہ تھی تھا کہ ہمارے اندر ہر دم، ایک سویا ہوا مذہب بھی موجود تھا جنہیں ہم حقیقت میں دوستوں کے بیچ نہ ماننے کی قسمیں بھی کھایا کرتے تھے مگر منڈی ہاؤس باہری گلیاروں سے ہو کر اپنے گھر کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے ہم ہندو بن جاتے ہیں۔ مسلمان بن جاتے ہیں کبھی رسم ورواج، پرب تیوہار کے گلیمر ہمارے اندر کے مذہبی آدمی کو زندہ کرتے تھے۔ کبھی ایران عراق یا اجودھیا کے حادثات ہماری غلطی یہ تھی کہ ہم ایک نام نہاد عقیدے کے لئے جینے کا ناٹک کر رہے تھے۔ صرف اتنا نہیں کہ ایک ڈھانچہ گر گیا۔ آپسی اتحاد کے نام پر ایک سوالیہ نشان لگ گیا۔ اسے صرف ایک حادثہ کہنا مناسب نہیں ہے۔ سیدھے کہا جائے تو ابری مسجد کا انہدام ایک فرقہ کی فتح اور دوسرے فرقہ کی شکست سے جڑا مسئلہ بن گیا تھا۔ پھر جلتے ہوئے گودھرہ نے اب تک نفرت کی اس آگ کو بجھنے نہیں دیا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو ہم ایک خطرناک انجام کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ ان حادثوں سے اگر تشدد کو تحریک ملتی ہے تو پھر اس پورے ملک کا کیا ہوگا؟ ایک پوری صدی گاتی بجاتی ہمار درمیان سے رخصت ہوگئی ہزاروں برس کا سفر ختم ہوا۔ نئے ہزاروں برس کا سفر شروع ہوا پچھلے ہزاروں برس کی تاریخ کا سب سے بدنما دن، چھ دسمبر تھا۔ آزادی کے 62 برسوں میں تقسیم کے بعد دو اہم پڑاؤ چھ دسمبر اور گودھرا کی شکل میں سامنے آ چکے ہیں۔ نفی الفی کے ہر دن کو ان بدنما تاریخوں سے گزرنا پڑے گا۔ آنے والے ہزار برسوں کے سفر میں یہ تاریخیں کلیدی حیثیت رکھیں گی اور ظاہر ہے اس کا اثر ہمارے ادب پر بھی پڑے گا خاص کر اردو ادب پر ہمارا اس وقت کا ادب، اس عظیم سانحہ کو نظر انداز کر کہ نہیں لکھا جا سکتا۔

غلاموں کی دنیا۔ سفیر احمد

انسان فطرتاً غلامی میں رہنا پسند کرتا ہے جو لوگ حاکم ہوتے ہیں وہ بھی دراصل غلام ہوتے ہیں اور کچھ نہیں تو اپنے ہی بنائے ہوئے اصولوں کے غلام بن جاتے ہیں۔ ملکوں کے قانون بھی غلامی کی ایک ماڈرن شکل ہیں ہر ایک ملک کے قانون ہر ایک کے لئے یکساں نہیں ہیں۔ ان کی حکم ادولی کرنے والے کو سزا کا سامنا کرنا پڑتا ہے (اگر اُس ملک میں انصاف کا بول بالا ہو تو) بات یہاں تک رہے تو ٹھیک ہے میرے خیال کے مطابق اس دنیا کو سب سے زیادہ مسائل کا سامنا اس لئے کرنا پڑتا ہے کہ انسان اپنی خوشی سے غلامی کی زنجیر پہنانا چاہتے ہیں۔ ہر انسان ایک وقت میں کئی چیزوں کا غلام ہوتا ہے۔ خود ہی کوئی چیز ایجاد کرتا ہے۔ پھر اُسی کا غلام بن جاتا ہے۔

اب اسی بات کو لے لیں جب موبائیل فون نہیں تھا تب بھی دنیا چل رہی تھی۔ کوئی کسی کا کچھ نہیں بگڑتا تھا جیسا کہ اب اس چھوٹی سی چیز نے اس دنیا میں بگاڑ پیدا کر دیا ہے۔ یہ ابھی شروعات ہے لگتا ہے کہ دنیا کی تباہی اس ایجاد کی اگلی نسل سے ہوگی۔ آنے والے وقت میں اس کی خوفناک شکلیں نظر آئیں گی، ابھی تو انسان ان کا غلام بنا ہوا ہے۔ اگر کسی کے پاس موبائیل فون نہ ہو تو اس کا سانس لینا دُوبھر ہو جاتا ہے۔ کچھ دن پہلے میں نے اپنے ایک دوست کو دن میں کئی مرتبہ موبائیل میں فون کیا لیکن اُس سے رابطہ نہ ہو سکا۔ چند دنوں بعد دوست ملا تو میں نے کہا تم موبائل فون نشی ہو سوتے جاگتے ہر وقت اپنے پاس رکھتے ہو۔ یہاں تک کہ باتھ روم میں بھی اس کے بغیر نہیں جاتے

روزانہ تمہیں تو (بقول تمہارے) اس کے بنا قبض کی شکایت ہو جاتی ہے۔اس کے بغیر تمہیں تمہاری زندگی اُدھوری دکھائی دیتی ہے۔فلاں دن میں نے کئی بار فون کیا اور تمہارا فون بند ملتا تھا۔کیا بات ہے۔آخر تم اُس کے کے بغیر زندہ کیسے بچ نکلے۔وہ دوست پہلے تو ہنسا پھر بولا۔یار تمہیں تو معلوم ہے موبائل میری کمزوری بن چکا تھا۔میں ہر سال نئے سے نیا سمارٹ فون خریدتا ہوں میری بیوی اور بچے میری اس عادت سے سخت تنگ تھے۔بچے میرے موبائل کو میری پہلی بیوی اور اپنی ماں کو دوسری بیوی کہتے تھے۔بیوی کی نظروں میں بھی مشکوک رہتا تھا۔بہر حال میں اپنے حال میں مست ہی رہتا تھا۔جس دن تم فون کر رہے تھے۔اُس دن صبح سویرے اٹھتے ہی حسب عادت باتھ روم گیا۔جوں ہی حاجت میں مشغول تھا اور اچانک فون میرے ہاتھ سے سلپ ہو کر کموڈ میں گر گیا۔اب میں نہ اُس میں ہاتھ ڈال سکتا تھا اور اگر نکال بھی لوں تو وہ موبائیل میں استعمال نہیں کر سکتا تھا۔نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اُسے بھی فلش کر دیا۔وہ دن میرے لئے بڑا بوجھل تھا سارا دن کام پر بھی بوریت میں گھرا رہا (مجبوراً) گھر آیا تو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد معلوم ہوا کہ گھر میں بھی اچھے لوگ رہتے ہیں۔یار میں تو یہ رشتے ہی بھول چکا تھا۔اب اس کوشش میں ہوا کہ اس دس سالہ غلامی سے مکمل نہیں تو آدھی آزادی حاصل کرلوں۔اب یہ میرا لینڈ لائن نمبر ہے۔گاڑی میں بھی فون فکس کروا لیا ہے۔اس ای میل پر تم رابطہ کر سکتے ہو۔اب میں ہاتھ میں موبائیل فون نہیں رکھنا چاہتا۔یہ تو ایک چھوٹی سی بات ہے مگر ایک محتاط اندازے کے مطابق دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی اس سیل فون کی غلام بن چکی ہے۔یہاں تک کہ خودکش لوگ بھی جنت حاصل کرنے کے چکر میں کافروں کی اس ایجاد کا بھرپور استعمال کرتے پائے جاتے ہیں۔آج سے تقریباً پچیس سال پہلے دنیا والے اتنے انتہا پسند شدت پسند مذہبی جنونی نہیں ہوا کرتے تھے۔جتنے آج کل بن چکے ہیں حالانکہ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ زمانے کی ترقی کے ساتھ لوگ زیادہ لبرل اور باعلم ہوتے۔آج کل پہلے زمانوں کے مقابلے میں علم کا حصول انتہائی آسان ہے۔علم تک رسائی کی جدید سہولت حاصل کرنا کوئی معرکہ نہیں رہا۔اب اگر کوئی علم حاصل کرنا چاہے۔تو اُس کو گھر پہنچتے ہی اس کی سہولت میسّر آجاتی ہے۔مگر اس ٹیکنالوجی اور علمی دور میں بھی ہر قسم کی مذہبی شدت پسندی فرقہ واریت انسانوں کی انسانوں سے نفرت بھی برابر ترقی پر ہے۔اس کا پھیلاؤ دن بدن ہر انسان میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔چاہے وہ پڑھا لکھا ہو کہ انپڑھ۔دونوں ہی طرف جوش وخروش سے شمولیت کرتے چلے جا رہے ہیں۔بظاہر تعلیم اور علم کو مات پڑتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ہم اگر اپنے پرانے بزرگوں کو دیکھیں تو وہ تمام لوگ آج کے لوگوں سے کم پڑھے لکھے اور محدود علم کے ہوا کرتے تھے۔مگر آج کے لوگوں سے کہیں زیادہ روادار اور کشادہ ذہن اور صاف گو اور سچے انسان تھے۔ہر قسم کی مذہبی شدت پسندی سے پاک تھے۔جہالت شدت پسندی کیوں زوروں پر ہے ایسا کیوں کر ہو رہا ہے۔کوئی جاننے کی کوشش میں نہیں۔انسانوں کی بڑی تعداد خوشی سے شدت پسندی کی زنجیروں میں جکڑی جا رہی ہے۔یہ کیسے ممکن ہے کہ شدت پسندوں کا پیغام چند منٹوں میں دنیا کے کونے کونے میں پہنچ جاتا ہے۔دنیا میں بسنے والا محروم طبقہ اس کو حق کی آواز میں دبے جاتے ہیں۔وہ سب سے پہلے شدت پسندوں کو شکار بن جاتے ہیں۔آخر ایسا کیوں ممکن ہو رہا ہے۔میرے خیال کے مطابق یہ ایک انسانی ماسٹر پلان ہے۔اس لئے مذہبی شدت پسندوں کی بظاہر ہتک کی جا رہی ہے دوسری طرف ان کو ہر قسم کی جدید سہولتیں بھی دی جا رہی ہیں۔سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ، فیس بک اور ٹویٹر اور نہ جانے کتنے ہی چینل تک اُن کی رسائی ممکن کی جا رہی ہے۔ان سب جدید علوم کا مالک تو امریکہ یا ویسٹرن ورلڈ ہے۔اگر یہ لوگ چاہیں تو ایک سیکنڈ میں اُن کی تبلیغی سرگرمیاں اور برسر عام سر کاٹنے کی جان لیوا فلمیں اُن کے سر کاٹنے اپنے تمام نیٹ ورک پر روک دیں۔یہ بہت گہری چالیں ہیں جو عام آدمی کی سمجھ سے بالا تر ہیں۔اب انسانوں کی غلامی رسی اور گلے میں سنگل ڈالنے کا نام نہیں۔آنے والے وقتوں میں انسانوں کو اُن کے علاقوں میں غلام بنا کر کر رکھا جائے گا۔ہوگا وہی یا وہی کچھ ہو رہا ہے۔جو امریکی سیاست دان (اولڈن ٹرمپ) نے کہا ہے۔وہ تو ووٹوں کی لالچ میں بڑ بولا نکلا۔اصل خفیہ پلان کو زبان عام کر دیا۔کوئی مانے یا نا مانے میں مانتا ہوں کہ اس نے حقیقت بیان کی ہے۔جو بھی وہاں کا لیڈر ہوا کرے گا وہی جو ٹرمپ نے کہا ہے لیکن آرام سے نام لئے بغیر۔لگتا ہے پہلے کی طرح اب بھی لوگ اپنی آئندہ نسلوں کے نام بدلنے پر مجبور کر دئے جائیں گے۔یہ مسائل رات گئی بات گئی والے نہیں کیونکہ اس دنیا کو ان کے ٹھیکیداروں نے تباہ کرنا ہے۔زمین کی تباہی صرف اور صرف انسانی سازشوں کے نتیجہ پر ہوگی۔کوئی اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ایک ذرّے سے بھی کم حیثیت ہے ہماری۔حیرانگی ہے یہ سب کچھ جانے کے بعد ہم ایک دوسرے کا خاتمہ چاہتے ہیں وہ بھی صرف غلام بنانے کی خاطر ایک دوسرے کے مذہب کو ہدف بنا کر۔گھن آتی ہے انسان کی چھوٹی ذہنیت پر۔

ملکہ وکٹوریہ

1819ء تا 1901ء

ثقلین احمد سڈنی

الیگزنڈرینا وکٹوریان 24 مئی 1819ء Kensington palace لندن میں پیدا ہوائیں۔وکٹوریہ کے والد کا نام شہزادہ ایڈورڈ تھا۔جو کینٹ اور سٹراتھرن کا ڈیک تھا اور شہنشاہ جارج سوم کا چوتھا بیٹا تھا۔دونوں باپ بیٹے کی وفات 1864ء میں ایک ہفتہ کے اندر ہوئی۔وکٹوریہ کی والدہ سیکس کوبرگ سافیلڈ کی شہزادی تھی جو دراصل وکٹوریہ (جرمن نژاد اور بیوہ تھی۔وکٹوریہ کی والدہ اس کی بہتر پرورش

اورتربیت کی لئے شاہی خاندان سے الگ ایک علیحدہ جگہ پر رہتی تھی جہاں اسے شاہی رسم ورواج کے علاوہ فرنچ ،جرمن ،اٹالین زبانیں بھی سکھائی جاتی تھیں۔وکٹوریہ کے تین بڑے بھائی تھے جوسب کے سب کم سنی میں ہی فوت ہوگئے جس کے بعدتخت برطانیہ کا کوئی بادشاہ امیدوار نہ بچا تھا۔وکٹوریہ کی والدہ نے اس کی اچھی تربیت کی جس کی وجہ سے جون وکٹوریہ عوام میں خاصی مقبول تھی۔چنانچہ 1837ءکووکٹوریہ سلطنتِ برطانیہ اورآئرلینڈ کی ملکہ بنی اورتا وفاتعرصہ 64سال تک اس تخت پر متمکن رہی۔یکم مئی 1876 کواس تخت کا دائرہ کاراور وسیع ہوگیا جب وہ ہندبھی بن گئی۔ملکہ وکٹوریہ نے 1840ء میں اپنے فرسٹ کزن البرٹ سے شادی کی جوسیکس برگ کا شہزادہ تھا۔ان کے ہاں نو بچے پیدا ہوئے۔جن کی شادیاں سارے براعظم کے مختلف شاہی اورمعزز خاندانوں میں طے پائیں۔جس کی وجہ سے اسے یورپ کی دادی اماں کہاجانے لگا۔

ملکہ کی پانچ بیٹیوں اور چاربیٹوں کے نام یہ ہیں۔ملکہ پیدائش 21نومبر 1840ء،وفات 15اگست 1901ء۔2ایلس پیدائش 25اپریل 1843ءوفات 14دسمبر 1874ء3ہیلینا پیدائش 25مئی 1846ءوفات 9جون 1923ء،4لوئز پیدائش 18مارچ 1848ءوفات 3دسمبر 1939ء 5بیٹرکس پیدائش 14اپریل 1857ءوفات 26اکتوبر 1944ء6۔ایڈورڈ ہفتم پیدائش 9نومبر 1841ءوفات 6مئی 1901ء۔ 7الفرڈ پیدائش 6اگست 1844ءوفات 30جولائی 1900ء 8۔آرتھر پیدائش یکم مئی 1850ءوفات 16جنوری 1942ء 9۔لیوپولڈ پیدائش 7اپریل 1853ءوفات 28مارچ 1884ء۔

1861ءمیں اپنے خاوندالبرٹ کی وفات کے بعدوکٹوریہ کوشدید صدمہ ہوااوراس نے عوام میں نمودار ہونا بند کردیا جس کی وجہ سے ریپبلکن پارٹی نے زور پکڑنا شروع کردیا۔لیکن اس نے اپنے آپ کو پھر سے سنبھالا اورایک بار پھرعوام میں شہرت پا گئی۔جس کا ثبوت اس کی گولڈن اورڈائمنڈ جوبلی کی تقریبات ہیں جوعوام میں جوش وخروش سے منائی گئی۔20جون 1887ءکو50سال مکمل ہونے پر گولڈن جوبلی منائی گئی۔جس میں یورپ بھر سے بادشاہ اورشہزادے شاہی دعوت میں شامل ہوئے۔اسی طرح 20جون 1897ءکووکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی منائی گئی۔اس موقع پرامام الزمان حضرت مسیح موعودنے ایک رسالہ 25مئی 1897 کوشائع فرمایا جس میں جوبلی کی تقریب پر معظّمہ کومبارکباداوردعاؤں کے علاوہ نہایت لطیف پیرایہ اورحکیمانہ اندازمیں آنحضرت ﷺ اوراسلام کی صداقت کااظہاراوران کے اصولوں کا ذکرفرمایا جوامن عالم اوراخوت عالمگیر کی بنیاد بن سکتے ہیں۔پھراسی رسالہ میں آپ نے معظّمہ کواسلام کی طرف بھی دعوت دی ہے۔

20جون 1897ءکوقادیان میں اس ڈائمنڈ جوبلی کے حوالہ سے ایک خصوصی تقریب کا بھی انعقادہواجس میں شمولیت کی لئے باہر سے بھی احباب تشریف لائے اورگورنمنٹ کی ہدایت کے مطابق مبارکبادکا ریزولیشن پاس کرکے تار کے ذریعہ سے وائسرائے ہندکوبھیجا گیااورکتاب کی چندکاپیاں نہایت خوبصورت جلدکراکے ان میں سے ایک وکٹوریہ قیصرہ ہندکی خدمت میں بھیجنے کے لئے ڈپٹی کمشنرپنجاب ضلع گورداسپورکو،ایک وائسرائے گورنرجنرل کواورایک جناب لیفٹیننٹ گورنرپنجاب کوبھیجی گئی اورجلسہ عام میں چھ زبانوں میں خاص طور پردعا کی گئی۔ملکہ وکٹوریہ کا 64سالہ دورکسی بھی برطانوی وکٹوریہ کا حکمران کا سب سے زیادہ بڑادورتھا جس وجہ سے اسے وکٹورین عہدکہاجاتا ہے۔یہ دوراپنی طاقت ،شہرت اوراثرورسوخ میں اپنی انتہا پرتھا جس میں صنعتی ،ثقافتی ،سیاسی ،سماجی ،سائنسی اورعسکری شعبہ جات میں نمایاں تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔جس کی بدولت سلطنت برطانیہ کی توسیع عمل میں آئی۔ملکہ وکٹوریا کی وفات 82سال کی عمر میں 1901ءکواوزربورن میں ہوئی۔جبکہ تدفین فرگمورونڈسر میں ہوئی۔ملکہ کی بہت سی یادگاریں موجودہیں۔مثلاً آسٹریلیا کے ایک صوبے کا نام وکٹوریا ہے افریقہ میں ایک جھیل اورایک آبشارکا نام وکٹوریہ ہے۔للّی کے خاندان میں ایک بڑے پتوں والے پودے کا نام وکٹوریہ کراس ہے۔کراچی کے ایک میوزیم اور بہاولپور کے ہسپتال کا نام وکٹوریہ ہےوغیرہ وغیرہ

سلطان صلاح الدین ایوبی
ایک متقی مجاہد۔ عاصی صحرائی

سلطان صلاح الدین یوسف ایوبی 1138ءمیں پیدا ہوا۔اُس کا چچا کوہ،نورنور الدین زنگی فوج کا سپہ سالار تھا۔شیرکوہ کی وفات کے بعدصلاح الدین کوسپہ سالار بنادیا گیا۔1183ءمیں نورالدین زنگی کے انتقال کے بعدصلاح الدین خودمختار ہوگیااورمصر میں اپنی سلطنت کومزید مستحکم اوروسیع کرلیااس نے یروشلم کے مسیحی حکمرانوں کوفلسطین اورشام سے بے دخل کردیا اُسے جوعظمت اورشان وشوکت حاصل ہوئی وہ اسی شاندار کامیابی کی وجہ سے ہے اس نے 1187ءمیں حطین کے مقام پرعیسائیوں کوکچل ڈالا، جس کے نتیجہ میں اسی سال کے بعد ایک دفعہ پھر بیت المقدس میں اسلامی پرچم لہرانے لگا اس موقع پر سلطان کی رواداری اورحسن سلوک کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے کسی ایک عیسائی شہری کے ساتھ بھی زیادتی نہیں کی گئی۔

مارچ1193ءمیں سلطان کا انتقال ہوگیالباس خوراک اورمکان کے لحاظ سے وہ سادگی کی تصویر تھا جس چیز نے عیسائیوں کوحیرت میں ڈالا وہ صلاح الدین کی سخاوت درگزراورمعاہدات کی پابندی ہے اُس شخص کے اوصاف ہیں جس نے انہیں شکست دی۔قسمت کا مارا نورالدین زنگی کے مزار پرفریادکررہا تھا’’اے نورالدین تو عدل و انصاف کی روشنی میں فیصلے کیا کرتا تھامگرکیا سارا انصاف تواپنے ساتھ قبر میں لے گیا؟‘

وہ اپنی دُکھ بھری کہانی بیان کرنے میں مصروف تھا کہ ایک مضبوط جسم والے بارُعب شخص نے اپنا ہاتھ بڑی شفقت سے فریادی کے کندھے پر رکھا اور بولا'' کیا بات ہے بھائی میرے آقا کو کیوں تنگ کر رہے ہو؟ وہ انصاف کی شمع اپنے اس غلام کے سپرد کر گئے ہیں بتاؤ تمہیں کس نے دکھ دیا؟ وہ شخص گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا کیوں کے اُس کے سامنے شام و مصر کا طاقت ور حکمران سلطان صلاح الدین ایوبی کھڑا ہوتھا۔

حضور میرا نام خالد ہے فریادی نے احترام سے جواب دیا'' میرا کاروبار تباہ ہو چکا ہے بھلے وقتوں کی نشانی ایک مکان بچا تھا جو ایک بااثر آدمی نے ہتھیا لیا ہے میں غریب اور کمزور آدمی ہوں وہ امیر اور طاقت ور'' خالد نے کہانی ختم کی تو سلطان فوراً اُسے لے کر اُس ظالم کے گھر جا پہنچا وہ شخص عادل حکمران کو دیکھتے ہیں تھر تھر کانپنے لگا پھر فوراً فریادی کے پاؤں سے لپٹ کر معافیاں مانگنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک خالد اُسے معاف نہیں کرے گا انصاف پسند سلطان اُسے نہیں چھوڑے گا۔ امیر اور بااثر آدمی نے اُسی وقت مکان اصل مالک کے حوالے کر دیا خالد بھر رونے لگا۔ صلاح الدین ایوبی نے حیران ہو کر پوچھا میرے بھائی مکان تو تمہیں مل گیا اب کیوں روتے ہو؟ حضور یہ خوشی کے آنسوں ہیں کہ آپ زنگی کے انصاف کو قائم رکھ سکے۔ خالد نے جواب دیا سلطان ایسا ہی انصاف پسند حکمران تھا۔ اپنے محسن استاد نور الدین زنگی سے اُس کی عقیدت زمانے میں مشہور ہے۔ ایک بار سرحدی قلعہ ''عزاز'' کو فتح کرنے کے لئے بڑی خوں ریز جنگ ہو رہی تھی سورج غروب ہو گیا مگر قلعہ فتح نہ ہو سکا یہ قلعہ ایک بلند پہاڑ پر واقع تھا اور اُونچی چٹان پچھلی دیوار کا کام دے رہی تھی۔ عجیب واقعہ پیش آیا ایک چھوٹی سی خوبصورت بچی گھوڑے پر سوار قلعے میں داخل ہوئی۔ سلطان نے اُسے دیکھا تو بھاگ کر گھوڑے کے قریب پہنچا اور بڑے احترام سے کھڑا ہو گیا۔ یہ پھول سی بچی نور الدین زنگی کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی اُس نے آتے ہی ایسا مطالبہ کیا کہہ بڑے بڑے سالار حیران رہ گئے'' مجھے فوراً یہ قلعہ چاہیے'' '' آقا زادی! آپ اس قلعہ کو لے کر کیا کریں گی'' سلطان نے مسکرا کر پوچھا۔'' ہم اس میں کھیلیں گے'' بچی نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ سلطان نے فوراً وہ قلعہ جسے بڑی جان پر کھیل کر فتح کیا تھا بچی کے حوالے کر دیا۔ سرداروں نے دبی زبان میں احتجاج کیا تو سلطان نے جواب دیا خدا کی قسم! اگر وہ مجھ سے میری جان بھی مانگتی تو میں اُسے انکار نہ کرتا'' یہ صلیبی جنگوں کا دور تھا ایک طرف یورپ کے تقریباً سارے حکمران اور دوسرے طرف اکیلا سلطان صلاح الدین ایوبی جسے اپنے کم عقل بھائیوں سے بھی لڑنا پڑا۔ گویا اپنے بیگانے سب مل کر اُسے للکار رہے تھے اپنوں کی نااتفاقی کی وہ سے مسلمانوں کا پہلا قبلہ بیت المقدس عیسائیوں کے قبضہ میں جا چکا ہے۔ وہی بیت المقدس جہاں سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے تھے اُسے آزاد کرانے کے لئے ایوبی لشکر لاتعداد یورپی لشکر سے ٹکرایا۔ خوں ریز جنگ ہوئی مسلمان مجاہد بے جگری سے لڑے اور انہوں نے دُشمن فوج کو تباہ و برباد کر دیا۔ بیت المقدس آزاد کرانے کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی نے مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھی۔ عیسائیوں کے لئے عام معافی کا اعلان کیا اور دشمن کی بچی کھچی فوج کو ہتھیاروں سمیت شہر سے نکل جانے دیا۔ بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو سارے یورپ میں طوفان آ گیا۔

یورشلم کی لاٹ پوری نے جسے سلطان نے کمال مہربانی سے قیمتی ساز و سامان دے کر رخصت کیا تھا لوگوں کو بھڑکانا شروع کیا۔ وہ بڑی سی تصویر اُٹھائے پھرتا تھا جس میں حضرت عیسیٰ کو زخمی حالت میں دکھایا گیا تھا۔ اور ایک مسلمان سپاہی اُن پر حملہ کر رہا تھا۔ پادری کی اس حرکت سے پورے یورپ کے لوگ دیوانے ہو گئے اور صلیبی مجاہدین کی فوج میں بھرتی ہونے لگے۔ بچے بوڑھے اور جوان، سب نے مل کر اتنا بڑا لشکر تیار کر لیا جو کسی نے دیکھا نہ سنا۔ ان میں رچرڈ جیسا بہادر دشن بھی تھا۔ جو شیر دل کے نام سے مشہور تھا اور کرک کے قلعہ دار ریجنالڈ جیسے تنگ دل، متعصب حکمران بھی، جو حاجیوں کے قافلے کو لوٹتا تھا۔ وہ جس قافلے کو لوٹتا اُسے بڑے غرور سے کہتا بلاؤ اپنے پیغمبر اسلام کو مدد کے لئے میں تمہیں قتل کرنے لگا ہوں۔ بے ادبی اور گستاخی بھرے یہ الفاظ صلاح الدین تک پہنچے تو اُس نے قسم کھائی قسم ہے مجھے اپنے پروردگار کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں اُس شیطان جو اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا۔ ایک بار پھر پورا یورپ ایوبی لشکر کے مقابلے میں آ گیا۔ جنگ سے پہلے رچرڈ اچانک بیمار ہو گیا۔ صلاح الدین کو خبر ہوئی تو اُس نے نہ صرف اپنا خاص طبیب بھیجا بلکہ کوہ لبنان نے منگوا کر برف بھیجی تازہ پھل بھیجے رچرڈ ٹھنڈے علاقے کا باشندہ تھا اس علاقے کی گرمی برداشت نہ کر سکا۔ یہ حسن سلوک دیکھ کر رچرڈ نے حیرانگی کا اظہار کیا تو طبیب نے کہا ہمارے سلطان کا فرمان ہے رچرڈ ہمارے علاقے میں مہمان بن کر آیا ہے اور مہمان خواہ دشمن ہی کیوں نہ ہو اُس کی خدمت ہمارا فرض ہے'' رچرڈ نے ایسا دل والا دشمن کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ وہ صلاح الدین کی دل سے قدر کرنے لگا۔ پھر ایسی جنگ ہوئی کہ خون ندیاں بہنے لگیں صلیبی سپاہیوں کو یورپ کے ہر ملک سے تازہ کمک مل رہی تھی ایک روز لڑتے لڑتے رچرڈ کا گھوڑا زخمی ہو گیا صلاح الدین بہادر دشمن کی توہین برداشت نہ کر سکا وہ پیدل جنگ کرے۔ اُس نے ایک سپاہی کے ہاتھ ایک تازہ دم گھوڑا بھیجا۔ جب وہ سپاہی گھوڑا دے رہا تھا تو رچرڈ کے ایک سپاہی نے اُس پر حملہ کر دیا رچرڈ شرمندگی سے زمین پر گڑ گیا پھر طیش میں آ کر اُس نے اپنے سپاہی کی گردن میں ایسا گھونسا مارا کہ وہ نے ہوش ہو کر گر گیا۔ جولائی کا مہینہ اور جمعہ کا دن تھا جب حطین کے مقام پر فریقن کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ یورپی لشکر کو شکست فاش ہوئی بڑے بڑے بہادر جرنیل جنگی قیدی بنے جن میں رینالڈ بھی شامل تھا۔ سلطان نے اُسے طلب کیا اور للکار کہا'' میں اپنے آقا محمد عربی کے غلاموں کا غلام اُن کے ناموس کا محافظ تیرے سامنے کھڑا ہوں'' یہ کہا اور تلوار کے ایک ہی وار سے اُس گستاخ کا سر قلم کر دیا سلطان صلاح الدین ایوبی کی ساری زندگی اسلام کی خاطر جہاد کرنے میں گزری۔ بیت المقدس کو آزاد کرانا اُس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

گھر پیارا گھر۔ سمین

گھر ایسا ہونا چاہیئے کہ گھر کے تمام افراد اُس گھر میں جا کر سکوں پائیں۔ والدین اور دیگر افراد خانہ کے ساتھ ہمیشہ نیک سلوک کریں آپس کا تعلق بہت پیار محبت کا ہو۔ گھر کے افراد آپس میں گفتگو کے وقت تو تکار سے پرہیز کریں حفظ مراتب کا خیال رکھیں ایک دوسرے پر بدظنی سے بچیں چھوٹے بڑوں کی عزت اور اطاعت کریں اور بڑے چھوٹوں سے شفقت کا سلوک کریں نیز تمام افراد خانہ دوستوں اور دیگر ملنے جلنے والوں کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کریں۔

گھر میں السلام علیکم، جزاکم اللہ، ماشاءاللہ، بسم اللہ، الحمدللہ، انشاءاللہ، ﷺ وغیرہ الفاظ رائج کریں۔ گھر میں جلدی سونے اور جلدی جاگنے کی عادت کو رواج دیں۔ گھر میں صبح کے وقت تلاوت قرآن کریم کو رواج کریں۔ مسجد میں باجماعت نماز کے علاوہ گھروں میں بھی سنتیں اور نوافل پڑھنے چاہییں مسجد میں نہ جا سکنے والے افراد اور خواتین گھر میں وقت پر نماز ادا کرنے کا اہتمام کریں۔ جو افراد خانہ مسجد میں جا کر نماز باجماعت ادا کر سکتے ہوں گھر کے ذمہ دار افراد اور خواتین انہیں توجہ دلاتے رہیں۔ رات بستر پر جانے سے پہلے وضو کرنا سنت ہے۔ رات سونے سے پہلے بستر کو جھاڑ لیں عشاء سے پہلے سونا نہیں چاہیے اور عشاء کی نماز کے بعد بے مقصد باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ گھر میں بھی مناسب لباس پہننے کا التزام کریں۔ اگر کوئی مہمان آئے تو کھلے دل سے مہمان نوازی کریں۔ لیکن حد سے زیادہ تکلف نہ کریں۔ اگر آپ کسی کے گھر میں جائیں تو عین دروازے کے سامنے نہ کھڑے ہوں اور دراڑوں سے کے اندر مت جھانکیں۔

دروازے سے ایک طرف ہو کر اجازت لیں اور دروازہ کھٹکھٹائیں اور نہ ہی گھنٹی بجاتے چلے جائیں۔ اگر تین دفعہ وقفہ وقفہ پر اجازت طلب کرنے پر بھی اجازت نہ ملے تو برا منائے بغیر واپس آجائیں۔ ایسے کمرے کی چھت پر نہ سوئیں جس کی منڈھیر نہ ہو اور چھت کی منڈھیر پر بیٹھنے سے گریز کریں۔ گھر کے افراد آپس میں ایک دوسرے کی ذاتی زندگی PRIVACY کا مکمل احترام کریں مثلاً بغیر اجازت دوسرے کے خطوط یا ڈائری وغیرہ پڑھنا۔ والدین ٹی وی کے پروگرام اپنے بچوں وغیرہ کے ساتھ بیٹھ کر دیکھنے کی کوشش کریں اور پروگرام کی اچھائی یا برائی پر تبصرہ کرتے جائیں گھر کی باتیں دوسروں میں کرنے سے حتی الوسع گریز کریں۔ اپنے گھر میں شور و غل کر کے یا کسی دوسرے ذریعے سے اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ دیں۔

بھرم

افسانہ

امجد مرزا امجد

ملک معراج دین خاندان کا لیڈر ہی نہ تھا اپنے پورے علاقہ میں اس کا بہت رُعب اور دبدبہ تھا اچھی خاصی زمین کا مالک ہونے کے ساتھ دو بیٹے لندن میں بہت بڑے اسٹور کے مالک تھے اور باقاعدگی سے ہر ماہ باپ کو اچھے خاصی رقم بھیجتے تھے دونوں بیٹے بال بچوں والے تھے اور کئی بار اپنے باپ کو لکھ چکے تھے کہ چند ماہ کے لئے لندن آئیں اور یورپ کی سیر کریں اپنے پوتے پوتیوں سے ملیں اور سب کو خدمت کا موقع دیں۔ ملک معراج دین شام کو اپنی حویلی کے صحن میں حقے کا لمبا سا کش لے کر اس کا دُھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بڑے بڑے فخر سے گاؤں کے دوسرے لوگوں کو بتاتا جو شام پڑتے ہی ملک صاحب کی حویلی کا رُخ کرتے جہاں انہیں ہر دم تازہ حقہ ملتا اور چائے کے ساتھ شہر سے منگوائی ہوئی کیک رس بھی۔ ”میرے دونوں بیٹے وہاں گروسری کا بہت بڑا اسٹور چلاتے ہیں اوران کے سارے گاہک انگریز ہی ہوتے ہیں“ ملک مونچھوں کو مروڑ کر کہتے گروسری انگریزی کے کھانے پینے کی چیزوں کو کہتے ہیں اتنا پیسہ وہ کماتے ہیں وہاں کہ ان سے سنبھالے نہیں سنبھلتا۔

میں بڑا منع کرتا ہوں مجھے نہ بھیجو میرے پاس زمینداری کا ہی مال اتنا آجاتا ہے مگر بہت نیک بچے ہیں وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں ہر مہینے دس بیس ہزار پھر بھی بھیج دیتے ہیں“ ملک صاحب نے اپنے سامنے بیٹھے لوگوں کو دیکھا وہ ان کے تاثرات پڑھنا چاہتے تھے سب پر اپنا رُعب جما ہوا دیکھ کر وہ مسکرائے۔ کہ نمبردار فضل دین بول اٹھا۔ ”کیوں نہیں ملک صاحب آپ نے ان کی پرورش جو ایسی کی نیک باپ کی اولاد بھی نیک ہی ہوگی“ حاجی پھتا فوراً بول اٹھا۔ ”بہت بھاگ والے ہو ملک صاحب بہت بھاگ والے“ اسی طرح ہر شام ملک معراج دین کی حویلی میں مجلس ہوتی گاؤں والے بہت تعریفی کلمات کہتے ملک صاحب اپنے دونوں بیٹوں کی تعریف سن کر خوش ہو جاتے آنے والوں کی خاطر مدارت تازے حقے اور گرم گرم الائچی والی چائے اور خستہ کیک رس سے کی جاتی۔ ملک معراج کی بیوی کو گزرے چار سال ہو گئے تھے دو بیٹیاں شہر میں بیاہی ہوئی تھیں یہ ہر اتوار کو شہر جاتا رات رات ان کے پاس رہتا اور واپسی میں دس کلو کا بڑا سا ٹوکرہ کیک رسوں کا بھروا کر لے آتا جو شام کو چائے کے ساتھ اپنے ملنے والوں کو پیش کرتا... گھر میں دو تین نوکر تھے جو اپنی بیوی بچوں سمیت حویلی کے عقب میں کوٹھڑیوں میں رہتے جو اس کی خوب خدمت کرتے اور ملک معراج دل کھول کر ان کی مالی مدد کرتا... ہر شام اہم موضوع اس کے دونوں بیٹے ہی ہوتے ہر مہینے وہ بینک ڈرافٹ کے ساتھ باپ کی منت کرتے کہ وہ ان کے پاس چلا آئے... ایک شام ملک

صاحب نے اپنے دوستوں سے پوچھ ہی لیا...

یار نمبردار ایہ میرے دونوں پتر بہت ضد کر رہے ہیں کہ میں ان کے پاس چند ماہ رہ آؤں تمہارا کی خیال اے...'' جی ملک صاحب آپ ضرور جائیں جی...اتنی نیک اولاد ہے آپ کی اور انہیں آپ کا وراگ بھی تو بہت لگا ہوگا نا جی۔۔۔تبھی تو بار بار آپ کو لکھتے ہیں'' ...نمبردار نے سنجیدگی سے کہا۔ملک صاحب سر ہلانے لگے جیسے اپنا پروگرام مرتب کر رہے ہیں...'' مگر ملک صاحب آپ ایک وعدہ کریں جی مہینہ ڈیڑھ انہیں مل ملا کر آپ واپس آ جائیں گے ورنہ پھر...ہمیں نہ آپ کے پیچھے پیچھے آنا پڑے ۔'' حاجی پھتے نے چائے میں کیک رس ڈبوئی اور گرم گرم منہ میں بھر لی...اور پھر ملک معراج دین کا ایسا ذہن بنا کر وہ ہر وقت اپنے بیٹوں کے لئے بے چین رہنے لگے دو تین ماہ لگ گئے سارے کاغذات مکمل ہو گئے اور ایک دن ملک صاحب پھولوں کے ہاروں سے لدے گاؤں سے نکلے ان کے دونوں داماد ان کو لینے آئے تھے گاؤں میں ایسا سماں تھا جیسے ملک صاحب حج پر جا رہے ہیں ہر کوئی ان کو مبارک دے رہا تھا اور پھولوں کے ہار گلے میں ڈال رہا تھا جانے سے پہلے انہوں نے اپنے نوکروں کو خاص ہدایات دیں کہ ہر شام اسی طرح صحن میں چارپائیاں بچھائی جائیں ورنہ بیٹھک میں انتظام ہو اور سب دوست اسی طرح آئیں حقہ پئیں گرم گرم چائے کے ساتھ میٹھے رس کیک کھائیں اور گپ شپ لڑائیں بس گیا اور آیا...مشکل سے مہینہ ڈیڑھ ہی رہوں گا۔اور ملک صاحب لندن پہنچ گئے ان کا ایک بیٹا اور بہو ایئر پورٹ پر ان کو لینے آئے دوسرا اپنے اسٹور پر تھا کار میں اتنی جگہ نہ تھی کہ ساری فیملی آ سکتی...ملک صاحب کو یہ بات پسند نہ آئی اوئے پتر مجھے سڑک تک چھوڑنے سارے گاؤں کے بوڑھے جوان بچے عورتیں آئیں اور اتنے ہار ڈالے کہ مجھے نظر نہ آتا تھا اور یہاں تم دو میاں بیوی لینے آ گئے بچوں کو لے آتے ۔''

''ابا جان یہاں کا ماحول کچھ اور ہے بچے اسکول گئے ہوئے تھے بھائی جان اسٹور میں مصروف تھے ورنہ اسٹور بند کرنا پڑتا اور یہ ناممکن تھا بس ابھی تھوڑی دیر میں گھر پہنچ جائیں گے آپ سب سے مل لیں گے...'' گھر پہنچ کر ملک معراج کو زیادہ خوشی نہ ہوئی۔''ارے پتر یہ کیسا گھر ہے تم لوگوں کو نیچے دکانیں اور اوپر چار کمروں میں تم سب رہتے ہو...کوئی بڑی سی حویلی لیتے جہاں بچے کھیلتے کودتے آزادی سے رہتے ...'' رات ملنے ملانے اور باتیں کرنے میں گزر گئی باپ کے پاس ایک بیٹا بیٹھتا پھر وہ نیچے دکان میں چلا جاتا تو دوسرا آ جاتا...کبھی ایک بہو پاس بیٹھتی پھر وہ چلی جاتی تو دوسری چند منٹوں کے لئے آ جاتی...ملک صاحب کا بڑا پوتا اجمل جسے سب پیار سے جمی کہتے دادا کے پاس ہی رہا اور باتیں کرتا رہا دوسرے روز ملک صاحب ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے پوتے کے ساتھ نیچے اسٹور دیکھنے گئے انہیں بھی شوق تھا کہ وہ گروسری دیکھیں جو گورے کھاتے ہیں اور جو بیچ بیچ کر بقول ان کے دونوں بیٹے اتنے دولت کماتے ہیں کہ ان سے سنبھالے نہیں سنبھلتی۔وہ اسٹور میں داخل ہوئے تو سامنے طویل سا کاؤنٹر تھا جس کے پیچھے اس کی دونوں بہویں اور بڑا بیٹا کھڑا گاہکوں کو بھگتا رہا تھا کاؤنٹر کے پیچھے چھت تک خوبصورت شیلف لگے ہوئے تھے جن میں سینکڑوں رنگ برنگی شراب کی بوتلیں اور شراب کے ٹین سجے ہوئے تھے اسی طرح کاؤنٹر کے دائیں جانب دکان کے اندر تک کئی درجن شراب کے ٹین کے بکس ایک دوسرے کے اوپر بڑے قرینے سے رکھے ہوئے تھے دکان کے درمیان میں چند ایک شیلف تھے جن پر خورد و نوش کا دوسرا سامان رکھا تھا۔دکان کے اندر گورے گوریاں ٹوکریاں لئے سامان چن رہے تھے مگر ان میں اکثریت انہی کی تھی جنہوں نے شراب کی بوتلیں اور ڈبے خریدنے کے لئے اٹھائے ہوئے تھے ملک معراج کی آنکھیں انگارہ بنی باہر نکلی پڑتی تھیں انہیں جسم میں کیڑے رینگتے محسوس ہونے لگے غصے سے کان کی لویں گرم ہو گئیں اور سانس پھولنے لگا۔انہوں نے جمی کا سہارا لیا ورنہ شاید وہ گر پڑتے...

انہوں نے کاؤنٹر کے پیچھے اپنی چھوٹی بہو کو دیکھا جو ایک انگریز کو بڑی سی بوتل شراب کی اور کچھ شراب کے ڈبے شاپنگ بیگ میں ڈال کر دے رہی تھی اور پھر پیسے وصول کر کے اس نے اسے بقایا ریزگاری دی اور مسکرا کر ''تھینک یو'' کہا...اور پھر دوسرے گاہک کی طرف متوجہ ہو گئی۔ملک معراج لڑکھڑاتا ہوا اپنے پوتے جمی کا سارا لیتے ہوئے بڑے بیٹے کے پاس گیا جو کچھ گروسری اور شراب کے چند ڈبے شاپنگ بیگ میں ڈال رہا تھا۔بیٹے نے کام کرتے ہوئے باپ کو مسکرا کر دیکھا...'' آؤ ابا جی ادھر سے اندر آ جائیں۔'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا جہاں سے کاؤنٹر کے پیچھے آنے کا راستہ تھا...اور گاہک سے پیسے لے کر کیش رجسٹر میں ڈالے۔ملک معراج نے اپنے سوکھے گلے کو تھوک نگل کر تر کیا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔''اوئے بے غیرتا ...یہاں تو شراب بیچنے کا دھندہ کرتا ہے اپنی بیوی اور بھابھی کو اس ناپاک دھندے میں لگایا ہوا ہے اسی کی کمائی تو مجھے بھی بھیجتا رہا اور میں اس کو کھاتا بھی رہا اور صدقہ زکواۃ بھی دیتا رہا...اوئے اس حرام کی کمائی پر تو اپنے بچے پال رہا ہے۔'' ان کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تھا اور وہ بہت کچھ اسے کہنا چاہتے تھے مگر جذبات سے مغلوب ہو گئے ان کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے آنسو نکل پڑے...بڑا بیٹا باپ کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا اس نے بیوی کو اشارہ کیا کہ اس کی جگہ سنبھالے اور باپ کو سہارا دے کر دکان سے باہر لے آیا فلیٹ میں جا کر اس نے باپ کو سمجھایا کہ یہاں کے کاروباری حالات کے مطابق یہ کرنا پڑتا ہے آف لائسنس ساتھ نہ ہو تو گروسری بکنی مشکل ہے اور پھر ان گوروں نے تو شراب پینی ہے ہم سے نہ لیں گے کسی ہندو سکھ کی دکان سے لے کر پئیں گے مگر باپ کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا وہ حرام حرام کی تکرار کرتا رہا۔''بس یہ حرام ہے تم بیچو تو بھی حرام اور گناہ اور پیو تو بھی حرام اور گناہ تمہاری ساری کمائی حرام کی ہے۔میں اب تمہارے پاس ایک دن بھی ٹھہرنا گوارہ نہیں کر سکتا اور نہ میں تمہارے کمائے ہوئے

رزق سے کوئی نوالہ کھاؤں گا میرا ٹکٹ ریٹرن ہے سیٹ بک کراؤ اور مجھے واپس جانے دو''... بیٹے اپنے باپ کی طبیعت سے واقف تھے اس کے فیصلے کی اہمیت جانتے تھے دو تین دن گھر میں بہت تناؤ رہا بیٹے بہویں روتی رہیں معافیاں مانگیں اپنی مجبوریاں بیان کیں مگر ملک معراج نے ان کے گھر نہ کچھ کھایا نہ ان سے بات کی اور پھر تین روز کے قیام کے بعد جہاز پر بیٹھ گیا بھوک اور نقاہت سے چلنا مشکل ہو رہا تھا مگر یہ فیصلہ اٹل تھا کہ اب بیٹوں کے گھر کا رزق اس پر حرام ہے۔ مضبوط اعصاب تھے اور اب بات انا کی بھی تھی... تین دن کے بعد کھانا جہاز میں کھایا اور دوسرے روز اسلام آباد ایئرپورٹ پر آن اُترے۔ ٹیکسی کی راولپنڈی چھوٹی بیٹی کے گھر چلے گئے وہ سب حیران تھے ابا جی چار دنوں بعد انگلینڈ سے واپس کیوں آ گئے انہیں وجہ بتائی اور ساتھ تاکید کی کہ یہ بات کسی اور کے کانوں میں نہ جائے۔

دو ماہ ملک معراج باری باری دونوں بیٹیوں کے پاس رہے اور پھر ایک دن اپنے دوست یاروں کے لئے سوٹ شام کو ملک معراج کی بیٹھک میں دو ماہ بعد محفل جمی تو حاجی پھتے نے حقے کا کش لے کر کہا۔ ''ملک صاحب آپ کیا گئے ہماری رونقیں ہی ختم ہو گئیں مگر یہ خوشی تھی کہ آپ اپنے بیٹوں کے پاس خوش باش ہونگے۔'' ملک معراج نے مسکرا کر فخریہ لہجے میں کہا۔ ''بھئی وہ ملک ایسا ہے جو وہاں جائے وہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے مجھے تو پتہ ہی نہ لگا کہ دو ماہ کیسے گزر رے بہویں اور پوتے پوتیاں دن رات میری خدمت میں مصروف رہے۔'' ''واہ... بھئی واہ'' حاجی پھتا جھوم کر بولا۔ ''ملک جی بڑے نصیبوں والے ہو نیک باپ کی نیک اولاد ہے اور پھر محنت اور حلال کی کمائی میں ایسی ہی برکت ہوتی ہے!'' ''ہوں''... ملک معراج نے سر ہلا کر لمبی سی ہوں کی اور دونوں ہاتھوں سے اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو خشک کرنے لگا... آج بیٹھک میں بیٹھے ہوئے سب آدمیوں میں س وہ خود کو بہت چھوٹا محسوس کر رہا تھا۔

ٹیسٹ:

سردار کی ماں کی طبیعت خراب ہوئی تو وہ اُسے ہسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر نے کہا اس کے دو ٹیسٹ ہونگے۔ سردار نے رونا شروع کر دیا۔ اب کیا ہوگا میری ماں تو اَن پڑھ ہے پہلے پتا ہوتا تو تیاری کروا کر لاتا۔

اُستاد:

اُستاد کا درجہ ماں سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ ماں اپنی گود میں صرف ایک بچے کو سلاتی ہے مگر قربان جاؤں اُستاد پر جو اپنے لیکچر میں پوری کلاس کو سلا دیتا ہے۔

مادر وطن:

ہمارے ملک میں لوگ ''قلم'' کو لکھنے سے زیادہ شلوار میں ناڑا ڈالنے کے کام میں استعمال کرتے ہیں۔ وہ قوم سماجی، معاشی اور تعلیمی ترقی کیسے کرے گی جو میراثی کو استاد، درزی کو ماسٹر، جاہل کو درویش، ظالم کو طاقتور، کم ظرف کو میر، وڈیرے کو سائیں، دادا گیر کو بھائی اور کسی بھی ننگے پاگل کو شخص کو بابا جی مانتے ہیں۔ سوچیئے۔

حاصل مطالعہ

دانشوروں اور تجزیہ نگاروں کے خیالات

وقت دعا ہے:

مندرجہ بالا عنوان کے تحت ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی اپنے مضمون الطاف حسین حالی کے متعلق لکھتے ہیں۔

''ملت اسلامیہ کو زوال پذیر اور ادبار کا شکار ہوتا دیکھ کر ان کے دل پر جو گزرتی تھی، اس کا حال ان کی شاعری میں صاف جھلکتا ہے۔ جنگ بلقان کے رُوح فرسا واقعات نے انہیں اس درجہ متاثر کیا کہ ان کے دُکھی دل سے ''فریاد'' نکلی جو ''عرض حال، بحضور سرور کائنات'' کے عنوان سے ان کے دیوان میں موجود ہے اور جس کے بعض اشعار آج بھی ہر قومی سانحہ پر مسلمانوں کو بیساختہ یاد آجاتے ہیں۔ اس لافانی اِستغاثہ کے چند اشعار آپ بھی دل تھام کر پڑھ لیجئے۔

اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ جو تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے
جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اس دین میں خود تفرقہ اب آ کے پڑا ہے
جس دین نے غیروں کے تھے دل آ کے ملائے
اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے

(نوائے وقت سنڈے میگزین مورخہ 25 جون 2006 صفحہ 10)

توبہ کی ڈھال

حسن نثار اپنے کالم چوراہا میں لکھتے ہیں۔

ہمارے ''اجتماعی امتحانات'' ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تو سنجیدگی سے سوچنا ہوگا کہ یہ سب کچھ غارت اور اکارت کیوں جا رہا ہے؟ کیا ہم پر توبہ کے دروازے بند ہو چکے؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے لیکن اس میں کوئی شک میں نہیں کہ ہم توبہ کی تعریف پر ٹھوکر پر ٹھوکر کھا رہے ہیں..... غلطی پر غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ توبہ آج بھی اور اب بھی آفات، خطرات، خدشات کے مقابل بیحد مضبوط ڈھال ہے بشرطیکہ زبانی کلامی نہ ہو بلکہ اعمال بھی تبدیل ہوں۔ ہماری توبہ ادھوری ہے۔ زلزلہ سے سیلاب تک کے درمیان بہت توبہ استغفار ہوئی لیکن یہ ڈھال اس لئے اپنا کمال نہ دکھا سکی کہ انفرادی اور اجتماعی طور پر ہمارے اعمال تبدیل نہیں ہوئے۔ نہ حکمرانوں

اور حکام نے اپنے لچھن بدلے نہ عوام نے اپنے رویوں پر نظر ثانی کی زحمت فرمائی۔ ایک بہت بھیانک روحانی مغالطہ ہمارے معاشرہ میں بہت عام ہوکر بہت ہی گہرا سرائیت کر گیا اور وہ یہ کہ محروم طبقات تو بالکل ہی معصوم ہوتے ہیں سو ان کا گناہ کے ساتھ کیا تعلق اور اگر وہ گنہگار ہی نہیں تو سزا کیسی؟ بظاہر یہ منطق مناسب لگتی ہے لیکن ہے نہیں کیونکہ گنہگاری کے لئے قارون ہونا ضروری ہے۔ جب کوئی ''محروم ومظلوم ''جھوٹی غیرت میں مبتلا ہوکر کالی وکاری وغیرہ کا ارتکاب کرتا ہے تو کیا عرش نہ ہلتا ہوگا؟ جب دباؤ یا دام کے عوض اپنے ہی جیسے کسی غریب کے خلاف جھوٹی شہادت دیتا ہوگا تو قدرت غضب ناک نہ ہوتی ہوگی؟ جب دودھ جیسی پاکیزہ شے میں جسے کبھی اللہ کا نور کہتے تھے۔

گندا پانی ملا تا ہوگا تو قدرت کو طیش نہ آتا ہوگا؟ جب کم تولتا اور جھوٹ بولتا ہوگا تو قدرت کیا محسوس کرتی ہوگی؟ جب پوری اجرت لے کر کام کے دوران فون سنتا، سگریٹ پیتا اور کام چوری کرتا ہوگا تو کیا قدرت خوش ہوتی ہوگی یا اس وقت اس پر خود کو مہربان محسوس کرتی ہوگی جب وہ آٹے کے چند توڑوں، چینی کے چند تھیلوں گھی چائے کے چند ڈبوں اور چند ہزار روپوؤں کے خاطر کسی خبیث، شیطان، بدمعاش، فراڈیئے اور بدکردار کو ووٹ دیکر اسے خود سمیت پوری قوم کی گردن پر سوار کرتا ہوگا؟ عرض کرنے کا مقصد یہ کہ گناہ کا تعلق غربت وامارت کے ساتھ نہیں، اپنی اپنی اوقات، بساط اور حالات کے ساتھ ہے.....راجہ کا گناہ بھی گناہ ہے پرجا کا گناہ بھی گناہ ہے پریذیڈنٹ کی خیانت بھی اور پٹواری کی خیانت بھی خیانت، آجر کی بدی اپنی جگہ اجیر کی اپنی جگہ! ضرورت ہے اوپر سے نیچے تک اپنے اپنے اعمال پر نظر ثانی کی تا کہ توبہ کی ڈھال اپنا حق ادا کر سکے ورنہ زلزلوں اور سیلابوں جیسے دو پاٹن کے بیچ یونہی پستے رہیں گے اور ہم پر کوئی ''کبیرا'' ماتم بھی نہیں کریگا۔ یہ معاشرہ ہمہ وقت زلزلوں، دہشت گردیوں اور سیلابوں کی لپیٹ میں ہے۔ توبہ کی ڈھال اٹھاؤ جس کا مطلب ہے اپنے اعمال میں تبدیلی، اپنے رویوں پر نظر ثانی ورنہ کہانی آگے چلتی دکھائی نہیں دیتی۔

(روزنامہ جنگ 23 اگست 2010ء)

دعائیں کیوں قبول نہیں ہوتیں

ماہنامہ ''تحریک اصلاح معاشرہ پاکستان'' (جنوری 2001ء) نے مندرجہ بالا عنوان سے حسب ذیل اداریہ سپرد اشاعت کیا۔ ''ماہ رمضان کے دوران میں ایک دن تحریک اصلاح معاشرہ پاکستان کے بزرگ ساتھی جناب محمد سلیم ہاشمی صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ دوران گفتگو پوچھنے لگے کہ کیا کبھی آپ نے غور کیا کہ ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟ ہر سال بیس پچیس لاکھ مسلمان حج کے موقع پر جمع ہوتے ہیں، طویل سفر کر کے آتے ہیں، رو رو کر امت مسلمہ کے اتحاد، ملت اسلامیہ کی ترقی وخوشحالی، کشمیر، فلسطین، چیچنیا اور دیگر خطوں کے مسلمانوں کی مشکلات کے خاتمے اور ان کی آزادی کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ اور کافروں کی تباہی وبربادی کی بددعائیں مانگتے ہیں مگر کوئی دعا قبول نہیں ہوتی۔ رائے ونڈ میں تبلیغی جماعت کا ہر سال نو دس لاکھ کا اجتماع ہوتا ہے جس میں بڑی تعداد میں لوگ خصوصی طور پر محض دعا کے لئے شریک ہوتے ہیں۔ ہر سال دینی جماعتوں کے بڑے بڑے اجتماعات ہوتے ہیں، نماز جمعہ کے اجتماعات ہوتے ہیں، ماہ رمضان میں تو بڑی سے بڑی مسجد بھی کم پڑ جاتی ہے۔ عیدین پر ایک ارب کے قریب مسلمان نماز عید کے اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں۔ ماہ رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف میں شہر بستے ہیں۔ ان اجتماعات میں مسلمان کتنی دعائیں مانگتے ہیں۔ مسلمانوں کی ترقی وخوشحالی اور کافروں کی ہلاکت وبربادی، کشمیر، فلسطین، چیچنیا کی آزادی کی، شریعت اسلامی کے نفاذ کی۔ ان دعاؤں کے دوران میں کروڑوں آنکھیں آنسو بہاتی ہیں مگر پھر بھی ان کی دعائیں نہیں سنی جاتیں۔ کیا اللہ بہرہ ہے، اندھا اور بے بس ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ وہ تو دل میں پیدا ہونیوالے خیالات کو جانتا ہے۔ وہ تو علیم وخبیر اور قادر مطلق ہے۔ اس نے تو ان لوگوں کی بھی سنی جنہوں نے خانہ کعبہ میں 360 بت رکھے ہوئے تھے۔ کیا اس نے عبدالمطلب اور اس کے ساتھیوں کی دعا پر ابرہہ کے لشکر کو ابابیلوں سے تباہ نہیں کرایا تھا؟ پھر ہم مسلمانوں کی دعائیں کیوں قبول نہیں ہوتیں؟ کیوں ہر جگہ وہی ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں اور ذلیل وخوار ہو رہے ہیں؟

پھر خود ہی فرمانے لگے کہ ہماری دعاؤں کا قبول نہ ہونا ہماری بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔ عمرہ اور حج پر جانیوالوں نے کبھی نہیں سوچا کہ سفر حج پر روانہ ہونے سے پہلے یہ تو دیکھ لیں کہ ان کے عزیز واقارب اور ہمسایوں میں کتنے فاقوں کا شکار ہیں۔ کتنے مریض ہیں جو رقم نہ ہونے کے باعث اپنا علاج نہیں کرا پا رہے، کتنے ملازم ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانا نہیں مل رہا۔ ان لوگوں کا حق مار کر رقم بچانا اور سفر حج پر خرچ کرنا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟ یہ لوگ تو اپنے گھر پر بھی نظر نہیں ڈالتے کہ گھر میں شیطان نے ڈیرہ جمایا ہوا ہے اور بے حیائی ومنکرات کا ہر سامان وافر موجود ہے۔ شادی بیاہ اور رسم مہندی پر حیا سوزی کی کیا کوئی کسر چھوڑی جاتی ہے۔ کم تولنے والے، نمبر دو مال بیچنے والے، ذخیرہ اندوزی کرنے والے، دوسروں کے مال پر ناجائز قبضہ جمانیوالے نہیں سوچتے کہ وہ حج کرنے نہیں بلکہ اللہ سے مذاق کرنے جا رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے جسم کو اللہ کے پاک گھر میں لے جا رہے ہیں جو رزق حرام سے پلا ہوا ہے۔ نہ کوئی خود اس پر غور کرتا ہے نہ کوئی دوسرا اسے سمجھاتا ہے۔ سمجھانیوالے بھی آنکھیں بند کر کے حرام کھائے جا رہے ہیں اور مسجدوں کی تعمیر پر بھی حرام کی کمائی سے ملنے والے عطیات ہی لگائے جا رہے ہیں۔ کسی کے اندر اپنی ذات سے بھی ہمدردی نہیں کہ رزق حرام سے پلا ہوا جسم اسے دوزخ میں لیجائے گا۔ رزق حرام رشوت کے ذریعہ آئے، کم تول

کرآئے، ملاوٹ کرکے آئے، دھوکہ بازی سے آئے، ملازمین کا حق مارکرآئے، قومی خزانے میں کرپشن سے آئے، اس سے پرورش پانے والا جسم ناپاک ہوتا ہے اور اللہ کے گھر کو ناپاک کرتا ہے۔ کیا کوئی فرد اپنے گھر کو ناپاک کرنے والے کی فریاد سنے گا؟ ہرگز نہیں۔ تو پھر اللہ کیوں سنے؟ اگر کوئی فرد کم نہیں تولتا، ملاوٹ نہیں کرتا، نمبر دو مال نہیں بیچتا بلکہ دیانت داری سیکاروبار کرکے دولت کماتا ہے مگر اپنی غریب ورشتے داروں، دوستوں، ہمسایوں اور ملازموں کو ان کا وہ حق نہیں دیتا جو اللہ نے اس کی کمائی میں رکھا ہے تو پھر بھی اس کی جمع کی ہوئی دولت صحیح نہیں ہے۔ سب کے حقوق ادا کرکے دولت جمع ہو تو پھر حج کرنے جائیں تو گناہ بھی معاف ہوں گے اور دعائیں بھی قبول ہوں گی۔ لیکن ہمارے یہاں تو صورت حال ہی مختلف ہے، آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ نہ والدین اولاد کی تعلیم وتربیت اور رزق حلال سے پرورش کے سلسلہ میں اپنے فرائض ادا کررہے ہیں اور نہ اولاد کو اپنے فرائض کا علم ہے۔ نہ مالک اپنے فرائض سے آگاہ ہے۔ اور نہ ملازم۔ ہر فرد دوسرے کو دھوکہ دیکر اس سے چھیننے کی کوشش کررہا ہے۔ حلال وحرام اور جائز وناجائز کی۔ کسی کو تمیز ہی نہیں رہی۔ علماء اب علماء نہیں رہے بلکہ پیشہ ور مقرر اور خطیب بن گئے ہیں"۔ (تحریک اصلاح معاشرہ پاکستان جنوری2001ء)

دعائے رمضان

جناب ارشاد احمد عارف نے اپنے کالم میں دعا کے عنوان سے ایک صاحب کی مرسلہ طویل دعائے رمضان شائع کی ہے اس کا ایک حصہ درج ذیل ہے۔ یا اللہ ناراض نہ ہو، کیا ہوا جو کبھی کبھار تیرے بندوں سے مانگ لیا۔ ہمیں تو تجھ سے ہی مانگتے تھے، ویسے جن سے مانگا ہے وہ بھی تیرے بندے ہیں۔ اے اللہ بش کے دل میں نرمی ڈال دے، ہماری محبت پیدا کردے، وہ بھیجے کے بجائے جیب سے سوچے، پاؤل کی جگہ ڈالر کو بھیجے اسے توفیق دے کہ ہمیں کیش دے، چیک دے، نوٹوں کی برسات کردے، ہم تیرے شکرگزار بندوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں ہمیں شکرگزار کردے، تیری رحمتوں کے بوجھ سے جھک جانا چاہتے ہیں، ہم نوٹوں کا بوجھ ڈال دے اور کاندھوں کی فکر نہ کرنا، اتنا بوجھ تو اٹھا ہی لیں گے۔ اے اللہ ہم تجھے یاد رکھیں گے، تیرا حکم مانیں گے، ڈالروں کی زکوٰۃ دیں گے مگر اللہ یہ ڈھائی فیصد تھوڑا زیادہ ہے اسے کچھ کم کردے، دیکھ ناراض نہ ہو ایک فیصد کردے ہماری تسلی ہوجائیگی۔ یہ ہم افغانوں پر خرچ کریں گے، انہیں خیمے دیں گے، پلاسٹک کی بالٹی دیں گے، پرانے جوتے دیں گے، وہ اچھے ہوتے ہیں، کھلے ہوتے ہیں، پاؤں کو کاٹتے نہیں۔ اے اللہ انکے یتیموں کو چندہ دیں گے، بیواؤں کو راشن دیں گے، بوڑھوں کو عینک بنوادیں گے۔ لڑکیوں کو سلائی مشین دیں گے، ان کا خیال رکھیں گے۔ تو بے فکر رہ ہم ہیں نا ان کے، ہم نہیں کریں گے تو کون کریگا؟ اسلامی بھائی ہیں، ہمسائے ہیں، ان کا بڑا حق ہے ہم پر تو فکر نہ کر، یہ سائیڈ ہم سنبھال لیں گے۔ دنیا بھر سے امداد لیں گے اور مل جل کے کھائیں گے۔ بس تو یہ ڈالر والا کام کردیا ور فوری کردے۔ ہم انتظار کریں گے۔

(نوائے وقت 29 نومبر 2001ء)

مغرب میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی

جناب اشتیاق بیگ لکھتے ہیں:

سابق فرانسیسی صدر فرانسس متراں سے ان کے دور حکومت میں ایک فرانسیسی صحافی نے سوال کیا کہ فرانس میں اسلام بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے جبکہ مسلمانوں کی آبادی میں بھی تیزی سے اضافہ ہورہا ہے۔ اگر یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا تو یہ بات خارج از امکان نہیں ہے کہ مستقبل میں فرانس اسلامی مملکت بن جائے، آپ اس خطرے کو کس طرح دیکھتے ہیں؟ فرانسیسی صدر نے کہا کہ اگر ایسا ہوا تو میں بھی مسلمان ہوجاؤں گا۔

دنیا کو دکھانے کیلئے فرانسیسی صدر کا صحافی کو دیا گیا جواب یقیناً سیاسی تھا مگر فرانسیسی حکومت اندرونی طور پر ہر وہ اقدامات کررہی ہے جن سے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو روکا جاسکے۔ سانحہ پیرس کے بعد فرانس میں ایمرجنسی کا نفاذ کیا جاچکا ہے اور اب فرانس ایسے قوانین وضع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جس کے تحت فرانسیسی شہرت کے حامل کسی بھی مسلمان کی شہریت منسوخ کرکے اسے کسی بھی وقت آبائی وطن ڈی پورٹ کیا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کیلئے مشکلات پیدا کرکے اُنہیں ہراساں کیا جارہا ہے تاکہ وہ خود فرانس چھوڑنے پر مجبور ہوجائیں اور اس طرح فرانس کو مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے خطرے سے نجات مل جائے۔ واضح ہو کہ فرانس میں 50 لاکھ سے زائد مسلمان آباد ہیں جو یورپ کے کسی بھی ملک میں مسلمانوں کی سب سے بڑی آبادی ہے۔ فرانس کی اوسطاً شرح پیدائش 8.1 فیصد ہے جبکہ فرانس میں مقیم مسلمانوں کی شرح پیدائش تقریباً 6 فیصد ہے۔ جن میں اکثریت 20 سے 25 سال کے نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ فرانس میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ 2027ء میں فرانس کا ہر پانچواں شخص مسلمان ہوگا۔ کچھ ہی سالوں میں فرانس اسلامی مملکت بن جائے گا۔ اسی طرح یورپی ملک برطانیہ میں گزشتہ 30 سالوں کے دوران مسلمانوں کی آبادی میں 30 گنا اضافہ ہوا ہے۔ تحقیق کے مطابق اگر برطانیہ مسلمانوں کی آبادی میں اسی رفتار سے اضافہ ہوتا رہا تو 2020ء تک برطانیہ میں مسجدوں کی تعداد گرجا گھروں سے تجاوز کرجائے گی۔ اور اس طرح اسلام برطانیہ کا نمایاں مذہب بن جائے گا۔ مذکورہ تحقیق کو اس بات سے بھی تقویت ملی ہے کہ 1997ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں

صرف ایک پاکستانی نژاد مسلمان ممبر چوہدری محمد سرور تھے جنہوں نے قرآن پاک پر حلف اٹھایا تھا لیکن 1997ء کے بعد ہونے والے ہر الیکشن میں مسلمان ممبر پارلیمنٹ کی تعداد میں دگنا اضافہ ہوتا جارہا ہے جن کی تعداد بڑھ کر 9 تک جا پہنچی ہے اور اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو وہ وقت دور نہیں جب برطانوی پارلیمنٹ میں مسلمان پارلیمنٹرین اکثریت میں ہوں گے۔ یورپ کے ایک اور اہم ملک بیلجیئم میں آبادی کا 25 فی صد مسلمان ہیں جب کہ جرمن حکومت نے پہلی بار اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ جرمنی میں مقامی آبادی کی گرتی ہوئی شرح پیدائش اور مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی شرح پیدائش کو روکنا ممکن نہیں لیکن اگر صورت حال یہی رہی تو 2050ء تک جرمنی مسلم اکثریت ملک بن جائے گا شاید انہی حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے لیبیا کے رہنما معمر قذافی نے مسلمانوں کے نام اپنے پیغام میں کہا تھا کہ یورپ کو فتح کرنے کیلئے مسلمانوں کو کسی ہتھیار کی ضرورت نہیں کیونکہ یورپ کے 50 ملین سے زائد مسلمان صرف چند دہائیوں میں یورپ کو اسلامی خطے میں تبدیل کر سکتے ہیں اور اس طرح وہ دن دور نہیں جب مسلمان کسی جنگ و جدل کے بغیر یورپ میں اسلامی پرچم لہرائیں گے۔ معمر قذافی کے مذکورہ دعویٰ کا یورپی ممالک نے سخت برا منایا اور بعد میں معمر قذافی کو راستہ سے ہٹا دیا گیا۔ ایک تحقیق کے مطابق کسی قوم اور اس کے کلچر کو برقرار رکھنے کے لئے اس قوم کا شرح پیدائش کم از کم 2.11 فی صد ہونا چاہیے لیکن ایسا نہ ہونے کی صورت میں وہ قوم 25 سال میں ہی زوال کا شکار ہو جاتی ہے۔ دنیا میں کوئی بھی معاشرہ 9.1 فی صف شرح پیدائش پر قائم نہیں رہ سکتا جبکہ 1.3 فی صد شرح میں سے کسی بھی معاشرے کا وجود ناممکنات میں سے ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی معاشی ماڈل نہیں جس کی معیشت 1.3 فیصد شرح پیدائش پر برقرار رہی ہو جس کی مثال اس طرح دی جاسکتی ہے کہ اگر کسی شادی شدہ دو جوڑے کے ہاں ایک ایک اولاد ہوتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ نسل 4 کے بجائے 2 افراد پر مشتمل ہوگی جن کی ایک اولاد ہوگی۔ اس طرح چار افراد کے خاندان کا صرف ایک پوتا یا پوتی ہوگی۔ اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تو آبادی میں مسلسل کمی ہوتی جائے گی۔ جس کے نتیجہ میں معاشرہ سکڑتا چلا جائے گا۔ اس وقت فرانس کا موجودہ شرح پیدائش 1.8 فی صد، انگلینڈ 1.6 یونان کا 3.1، جرمنی کا 1.3 اٹلی کا 1.2 سپین کا 1.1 ہے۔ اسی طرح یورپی یونین کے 31 ممالک کا اوسطاً شرح پیدائش 1.38 فیصد پر برقرار ہے تو مستقبل میں یورپی معاشرے کا وجود ناممکن ہو جائے گا مگر یورپ کی گرتی ہوئی شرح پیدائش کو مختلف ممالک سے آخر یورپی ممالک میں رہائش اختیار کرنے والے مسلمانوں نے کافی حد تک سہارا دیا ہے۔ جسے عام لفظوں میں اسلامک امیگریشن کہا جاتا ہے۔ یورپ میں مقامی آبادی کم ہونے کی وجہ مقامی لوگوں کا شادی نہ کرنا، ہم جنس سے شادی کا بڑھتا رجحان اور بچوں کی ذمہ داریوں سے راہ فرار اختیار کرنا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 2050ء تک یورپ کی کئی ممالک میں 60 سال سے زائد عمر کے مقامی افراد مجموعی آبادی کا 75 فی صد تک ہو جائیں گے اس طرح بچوں اور نوجوان نسلوں کا تناسب کم ہو کر صرف 25 فیصد رہ جائے گا۔ اسکے برعکس مسلمانوں کی آبادی میں کئی گناہ اضافہ ہو جائے گا جس میں اکثریت نوجوانوں کی ہوگی۔ یورپ کے علاوہ کینیڈا کا شرح پیدائش بھی 1.6 فیصد ہے۔ جو معاشرے کو برقرار رکھنے کی سطح سے 4 پوائنٹ کم ہے۔ اسلئے معاشرے کو برقرر رکھنے کے لئے کینڈا کی شرح پیدائش 2.11 ہونا ضروری ہے۔ مذہب اسلام کینیڈا میں تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن چکا ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق 2001ء سے 2006 تک کینیڈا کی آبادی میں 6.1 ملین افراد کا اضافہ ہوا جن میں سے 1.2 ملین مسلمان ہیں۔ اسی طرح امریکہ جس کی موجودہ شرح پیدائش 1.6 فیصد ہے۔ میں 1970ء تک صرف ایک لاکھ مسلمان آباد تھے مگر آج امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد بڑھ کر ایک کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے۔ جسے دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگایا جارہا ہے کہ آئندہ 30 سالوں میں مسلمانوں کی تعداد 5 کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ دنیا میں آبادی اور مذہب پر نظر رکھنے والی المیر کی ادارے پیو (PEW) نے اپنی حالیہ رپورٹ میں یہ اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد دنیا کی مجموعی آبادی کا 23.5 (ایک ارب 60 کروڑ) تک پہنچ چکی ہے۔ رپورٹ مین یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ مسلمان انڈونیشیا میں آباد ہیں مگر آئندہ 20 سالوں میں یہ اعزاز پاکستان کو حاصل ہو جائے گا جبکہ بھارت مسلم آبادی کے لحاظ سے دنیا کا تیسرا بڑا ملک بن جائے گا۔

قارئین! 9/11 کے امریکی صدر بش کا یہ جملہ کے 9/11 دنیا کی تاریخ کو بدل دے گا۔ آج درست ثابت ہو رہا ہے کیونکہ 9/11 کے بعد اسلام دنیا میں تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن جائے گا جب کہ قرآن دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کے کتاب بن چکی ہے جس کی ایک وجہ 9/11 کے بعد غیر مسلموں میں یہ تجسّس پیدا ہونا ہے کہ اسلام کیسا مذہب ہے کہ جس کے ماننے والے اس پر اپنی جان نچھاور کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ غیر مسلموں کا یہی تجسّس انہیں قرآن پاک کے مطالعے کی طرف لے جارہا ہے۔ جس سے انہیں نہ صرف قلبی سکون حاصل ہو رہا ہے بلکہ اسلام کو قریب سے سمجھنے اور جاننے کا موقع بھی مل رہا ہے۔ جبکہ ان کے ذہنوں سے اسلام کے بارے میں مغربی میڈیا کی پھیلائی گئی غلط فہمیاں بھی دور ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے باعث یورپی باشندے گشتہ ایک دہائی سے اسلام فوبیا کا شکار ہیں جن کی اکثریت اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ مذہب اسلام، یورپی قدروں کے لئے خطرہ بنتا جارہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جرمنی میں ہر ہفتے اسلام مخالف مظاہرے، سویڈن میں مساجد اور فرانس میں سکارف اوڑھے مسلمان خواتین

پر حملے روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔مغرب کو یہ خوف لاحق ہے کہ اگر اسلام کی سونامی کے سامنے بند نہ باندھا گیا تو یہ مذہب ایک دن پورے مغرب کو اپنے ساتھ بہالے جائے گا۔اسلئے مغربی ممالک مسلمانوں کے خلاف امتیازی قوانین بنانے سمیت ہر وہ قدم اختیار کر رہے ہیں جو اسلامی اور مسلمانوں کی پیش رفت روکنے میں مددگار ومعاون ثابت ہو سکے۔مغربی ممالک کی یہ کوشش بھی ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کو تفرقے کی بنیاد پر باہمی طور پر لڑوا کر کمزور کر دیا جائے اس سلسلے کی ایک کڑی شدت پسند تنظیم داعش ہے لیکن افسوس کہ مسلمان دشمنوں کی چال سمجھنے سے قاصر ہیں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بنے ہوئے ہیں۔کاش کے اُمت مسلمہ دشمنوں کی چال سمجھتے ہوئے اپنے باہمی اختلافات بھول کر اتحاد اور اتفاق اور یکجہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بار پھر متحد ہو جائے۔

(روزنامہ جنگ 2دسمبر 2015ء)

دلچسپ حقائق

ہر سال دنیا بھر میں ایک کروڑ ستر لاکھ افراد دل کی بیماریوں اور ہارٹ اٹیک کی وجہ سے ہلاک ہوتے ہیں۔دنیا میں ہر سال ہلاک ہونیوالے انسانوں کی مجموعی تعداد میں سے 31 فیصد اموات کا سبب دل کی بیماریاں ہوتی ہیں ۔ارسطو کو دنیا کا اوّلین اور سب سے بڑا فلسفی مانا جاتا ہے۔اس کا خیال تھا کہ دل ذہانت کا سرچشمہ ہے جبکہ دماغ خون کو ٹھنڈا رکھنے کا کام کرتا ہے۔آپ کا دل ہر روز اس قدر توانائی پیدا کرتا ہے جس سے ایک درمیانی جسامت کا ٹرک 32.1869 کلومیٹر تک چلایا جا سکتا۔دل دھڑکنے کی آواز دل کے چار والوو VOLVE کے کھلنے اور بند ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔سائنسدانوں نے پتہ چلایا ہے کہ عورتوں کا دل مردوں کے دل کے مقابلے 10 کا فیصد زیادہ تیزی سے دھڑکتا ہے۔ماں کے پیٹ میں بچے کا دل حمل ٹھہرنے کے چار ہفتے بعد دھڑکنا شروع ہوتا ہے۔''خون'' اور ''دل'' کے الفاظ شیکسپیئر کے ہر ڈرامے میں پائے جاتے ہیں۔

(روزنامہ دنیا 2نومبر 2014ء)

کیا شاعری سب بیان کرتی ہے؟

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

یہ دکھ بھی عجیب ہوتے ہیں۔تنہائیوں،محرومیوں،محبتوں اور جدائیوں کے دکھ، کہیں انت ہی نہیں ٹھہرتا ان کا۔کبھی گھٹن بن کر دل کو مٹھی میں کر لیتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انت ہو گیا اور کبھی دور پرے کھڑے مسکراتے اُسی گھٹن کو کم کرتے ہیں، روشنی بنتے ہیں اور اپنی ذات کی تلاش پھر سے شروع ہو جاتی ہے۔اِک چاک مل جاتا ہے جس پر ہم گھومتے ہیں اور اِک محور مل جاتا ہے جو ہمیں اپنے گرد دائرہ در دائرہ گھماتا ہے۔ہم اپنی جستجو میں ہوتے ہیں مگر بھلا دائرے میں بھی کوئی جستجو مکمل ہوئی؟ دائرہ بن کے گھومنا تو بس گھومنا ہے جب رُک گئے تو دائرے میں گھومنے والا ہر ذرہ صرف اپنی جگہ سمٹ کر رُک جائے گا وہ اُس خلا کو پُر نہیں کر سکے گا جو اُسے ذات کے اندر قطار در قطار کھڑے دُکھوں، گرد بنتی ہواؤں اور پس منظر میں سمٹتی، جدائیاں بانٹتی رفاقتوں نے عطا کیا۔

ایسی رفاقتیں جو اداسی، ہجر، خاموشی، اضطراب، امید، یاس، سُکھ، دُکھ، ہنسی، آنسو، آرزو، خلش اور کسک بانٹتی ہیں۔جو دل کی دنیا کو غم کے اندھیروں کے باوجود روشن ومنور کرتی ہیں۔سرِ شام یادوں کے دیئے جلائے، دل کے اندر بہتے لہو کے آنسو وَں سے اپنی لَو کو جلانے کی صدیوں پرانی روایت پر ڈگر بہ ڈگر چلتی جاتی ہیں اور بھلا ایسا کیوں نہ ہو یہ رفاقتیں وہی تو ہیں جنہیں اپنی اہمیت کا احساس ہے جنہیں فخر اور غرور ہے اپنے ہونے کا اور دوسروں کے دل میں سب سے اونچی مسند پانے کا۔جنھیں معلوم ہے کہ وہ کوئی مرہم رکھیں یا نہ رکھیں دل کا زخم ناسور بنتا رہے گا اور بن بن کے بگڑے گا مگر ازل تا ابد ختم نہیں ہوگا۔انہیں تا حشر اپنی ذات کا زعم ہے اور ہونا بھی چاہیے کہ ایسی لوح تو کہیں کہیں ملتی ہے کہ جس پر کسی انمٹ سیاہی سے جو نقش کندہ کر دیا جائے وہ پھر مٹا نہیں کرتا۔یہ سُکھ، یہ آرزوئیں، یہ سانسیں، یہ حرف، یہ لفظ، یہ شاعری غلام ہی تو ہیں بس اُن رفاقتوں کے۔یہ جستجوئے ذات جو شروع تو اپنی ذات سے ہوتی ہے مگر اس کا ہر رُخ، ہر موڑ اُن رفاقتوں تک محدود ہوتا ہے۔مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ دُکھ کبھی کبھی تھکا دیتے ہیں کسی سُکھ کو پانے کی تمنا میں دل مچل اُٹھتا ہے، روح کی تھکن بڑھ جاتی ہے اور روشنیاں بانٹتی اس دنیا میں چاند کی کرنوں سے چند کرنیں لے کر اپنا جیون روشن کرنے کو دل کرتا ہے۔

چاند جو منور ہے، روشن ہے، جس کی ٹھنڈی چاندنی جب اَوج پر ہو تو ساحل کی لہروں میں طوفان برپا کر دیتی ہے اور جب بے آب وگیاہ صحرا پر پڑتی ہے تو سراب پیدا کرتی ہے مگر یہ دنیا ہے یہاں تو ہم نے کبھی کبھی کہیں کہیں چاند کو بھی اندھیرے بانٹتے دیکھا ہے۔پہاڑ جیسی ہجر کی شاموں سے لے کر بھیانک اندھیری راتوں میں کہیں اِس کی ایک کرن بھی نہیں ملتی کہ زیست کو بتانے کا کوئی حوصلہ ہی مل سکے۔ایسے میں سُکھ کی یہ خواہش خود بخود اپنی موت مر جاتی ہے۔پھر ذات کی وہی تنہائی اور دُکھ کا وہی لامحدود صحرا۔اور ازل سے لے کر ابد تک اکیلے پن کا وہی سفر، وہی ریزہ ریزہ خوابوں کی چُبھتی کرچیاں، محرومیوں کے بوجھ تلے دبی خواہشیں، دم توڑتی محبتوں کی بے ترتیب ہچکیاں، پابُریدہ حسرتوں کی لاشیں۔بھلا اِس اُجاڑ سفر میں کون کسی کا ساتھ دے، کون مجروح جذبوں پر دلاسوں کے ''پھاہے'' رکھے۔کون ساتھ دے۔سوائے اپنے ہی دُکھ اور تنہائی کے، اور اسی تنہائی کے بنجر بن میں گئی رُتوں سے یادوں کے چراغ جلا کر، جذبوں کی محفلیں سجانا اور اُن محفلوں میں گلاب اُگانا اور اپنے بے ربط اور بے ترتیب بہہ جانے والے آنسوؤں سے ان گلابوں کو سراب کرنا اور ان سرابوں کے

پیچھے بھاگتے بھاگتے رنگوں اور روشنیوں سے سیاہی بنانا اور اسے صفحۂ قرطاس پر لفظوں کی صورت بکھیرنا اِسی کا نام شاعری ہے۔ مگر کیا شاعری سب بولتی ہے۔ کیا شاعری وہ سب کہہ سکتی ہے جو کہا جانا چاہئے؟ اِن سنگلاخ درد کے پہاڑوں سے گزرتی، اپنی ناتواں جاں پر تندوتیز ہواؤں کے طوفان برداشت کرتی کرب کی اِن مسلسل راتوں کی کہانی، بے یقینی اور مایوسی کی دُھول سے اٹی ہوئی بے خواب راتوں کی کہانی، یہ تجگوں کے عذاب اندھی راتوں میں اِک امیدِ سحر باندھے مسلسل جاگتی، بینائی کھوتی اُن آنکھوں کی کہانی، کیا یہ شاعری کہہ سکے گی مگر کہاں؟

یہ لفظ بے شک بہت توقیر والے سہی، جذبوں کی جاگیر سے گُندھے ہوئے، دل کی لَو سے چراغ جلاتے۔ مگر یہ لفظ کبھی حرفوں کی صورت میں بول اُٹھتے ہیں۔ اور کبھی کبھی دیوان بن کر بھی صرف ردی کا ڈھیر بن جاتے ہیں۔ انہیں اس سے کیا کہ انہیں لکھنے والے کس اذیت اور کرب سے گُزرے ہیں۔

دردمیرا بیاں اِن سے کب ہوسکا   شعر خاموش تھے، شاعری چپ رہی

وہ شہر جو دوسرے ممالک میں بستے ہیں

منور خورشید صاحب

☆ ملیلا اینڈ کیوٹا۔ اسپین (Melilla and Ceuta)

ملیلا اور کیوٹا اسپین کے دوخودمختار شہر ہیں۔ اگرچہ ان دونوں شہروں میں بسنے والے باسیوں کی شہریت کا تعلق اسپین سے ہے، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دونوں شہر بحیرہ روم کے کنارے واقع ملک مراکش میں پائے جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ اسپین اور مراکش بحیرہ روم کے کناروں پر آمنے سامنے واقع ہیں۔ اسی وجہ سے ان دونوں شہروں کو اسپینش افریقہ بھی کہا جاتا ہے۔ کیوٹا شہر اٹھارہ مربع کلومیٹر پر محیط ہے اور بیاسی ہزار نفوس پر مشتمل یہ شہر یکم جنوری 1668ء سے اسپین کی عملداری میں ہے، جب کہ اس سے متصل شہر ملیلا بارہ مربع کلومیٹر پر محیط ہے اور یہاں پر بھی بسنے والوں کی تعداد اٹھتر ہزار کے لگ بھگ ہے۔ دونوں شہروں کو اسپین نے 1995ء میں اپنا خودمختار شہر قرار دیا تھا۔ دونوں شہروں میں مسلمانوں کی کافی بڑی تعداد آباد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں شہروں میں 2010ء سے عیدالاضحیٰ پر سرکاری چھٹی بھی دی جانے لگی ہے۔ یاد رہے کہ اسپین میں سن 1492ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد مسلمانوں کا زوال ہوگیا تھا۔ اس سانحے کے بعد پہلی مرتبہ اسپین کے کسی شہر میں مسلمانوں کے تہوار پر سرکاری چھٹی کا اعلان کیا گیا ہے۔ دوسری طرف شمالی افریقہ کے بیشتر ممالک بالخصوص مراکش اور الجزائر کے عوام ان شہروں میں داخل ہوکر یورپی شہریت حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں شہروں کی سرحدی حدود پر اسپین کی حکومت نے تین میٹر اونچی خاردار تاروں کی باڑ لگا رکھی ہے۔ واضح رہے کہ مراکش کی حکومت ملیلا شہر پر اسپین کے قبضے کو غاصبانہ تسلط قرار دیتی ہے۔

☆ کیلینن گراڈ اوبلاسٹ۔ روس

(Russia,Kaliningrad Oblast)

کیلینن گراڈ صوبہ (اوبلاسٹ) روس کا ایک ایسا انتظامی حصہ یا صوبہ ہے جس کی جغرافیائی حدود اپنے مرکزی ملک روس سے علیحدہ ہیں۔ اس کے جنوب میں پولینڈ، مشرق اور شمال میں لیتھوانیا اور مغرب میں بحیرہ بالٹک واقع ہے۔ تاریخی طور پر یہ خطہ اُنیس سو پینتالیس میں دم توڑنے والی ریاست پرشیا کا مشرقی حصہ تھا اور یہاں پر جرمنی کی حکومت تھی۔ بعد ازاں دوسری جنگِ عظیم میں اس پر سوویت یونین کا قبضہ ہوگیا اور پھر سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد یہ روس کا حصہ بن گیا۔ تقریباً نو لاکھ چالیس ہزار کی آبادی والے اس صوبے میں اکثریت روسی زبان بولنے والوں کی ہے صوبے کا رقبہ پندرہ ہزار ایک مربع کلومیٹر ہے۔ لینن گراڈ معاشی طور پر روس کا انتہائی تیز رفتاری سے ترقی کرتا صوبہ ہے۔

☆ پوائنٹ رابرٹس، واشنگٹن۔ امریکہ

Point Roberts, Washington, United States

پوائنٹ رابرٹس کا علاقہ بنیادی طور پر امریکا کی ریاست واشنگٹن کے قصبے واٹ کام کا حصہ ہے، لیکن پوائنٹ رابرٹس تک پہنچنے کے لیے کینیڈا کی حدود میں سے گزرنا پڑتا ہے کیوں کہ یہ سرسبز علاقہ کینیڈا کے صوبے برٹش کولمبیا میں جزیرہ نما تسااوسن کے انتہائی جنوب اور بائیس میل کی دُوری پر وینکور شہر کے قریب واقع ہے۔ بارہ اعشاریہ پینسٹھ مربع کلومیٹر پر محیط اس شہر کی آبادی محض تیرہ سو نفوس پر مشتمل ہے۔ کم آبادی کے باعث شہر میں صرف ایک پرائمری اسکول ہے۔ تاہم سیکنڈری اسکول کے طالب علم روزانہ بس میں پینتالیس منٹ کا سفر کرکے کینیڈا سے گزرتے ہوئے واشنگٹن کے سرحدی علاقے بلائین پڑھنے جاتے ہیں۔ اسی طرح پوائنٹ رابرٹس میں اسپتال، ڈینٹسٹ، فارماسیوٹکل اسٹور وغیرہ نہیں ہیں اور چوں کہ امریکا کی گورنمنٹ کینیڈین ڈاکٹروں سے کرائے گئے علاج کو انشورنس کور نہیں دیتی، لہٰذا یہاں سے مریض بھی واشنگٹن جا کر علاج کرواتے ہیں، جو انہیں خاصہ مہنگا پڑتا ہے۔

☆ جبرالٹر۔ برطانیہ (Gibraltar, United Kingdom)

جبرالٹر جو جبل الطارق کے نام سے بھی پہچانا جاتا ہے، برطانیہ کا سمندر پار اہم دفاعی نوعیت کا علاقہ ہے۔ جبرالٹر کا ساحلی حصہ برطانیہ سے دور جزیرہ نما آئبیریا کے جنوب اور آبنائے جبرالٹر کے ساتھ بحیرہ روم کے داخلی مقام پر پھیلا ہوا ہے۔ واضح رہے کہ بحیرہ روم تین جانب سے یورپ، ایشیا اور افریقہ سے گھرا ہوا ہے اور صرف اس

مقام سے کھلا ہوا ہے جہاں پر آمنے سامنے اسپین اور مراکش ہیں اور اسی مقام پر جبل الطارق واقع ہے اور یہیں پر بحیرہ روم بحر اوقیانوس میں جا گرتا ہے، جب کہ شمال میں جبل الطارق یا جبرالٹر کی سرحدیں اسپین کے صوبے اُندلسیہ سے ملتی ہیں۔ چھے اعشاریہ آٹھ مربع کلومیٹر پر محیط اس علاقے کی آبادی بتیس ہزار ہے۔ سن سترہ سو تیرہ سے برطانیہ کی عمل داری میں شامل اس علاقے پر اسپین بھی اپنی ملکیت کا دعوے دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ علاقہ برطانیہ اور اسپین کے مابین کافی عرصے سے وجہ تنازعہ بنا ہوا ہے۔ کئی مواقع پر اسپین سے ملحق اپنی سرحد بند کر چکا ہے۔ تاہم اس وقت یہ سرحد کھلی ہوئی ہے اور سیاحوں کی آمد و رفت لگی رہتی ہے۔

☆ کابندا۔ انگولا (Cabinda, Angola)

تین لاکھ نفوس پر مشتمل کابندا کا علاقہ براعظم افریقہ کے جنوب میں واقع ملک انگولا کا صوبہ ہے، جو مکمل طور پر انگولا سے علیحدہ ہے۔ کابندا جغرافیائی لحاظ سے جنوب اور مشرق میں ڈیموکریٹک ری پبلک آف کانگو اور شمال میں ری پبلک آف کانگو سے ملا ہوا ہے، جب کہ اس کی مغربی سرحد بحیرہ اوقیانوس سے ملتی ہے پیٹرول اور دیگر معدنی وسائل سے بھرپور کابندا کا علاقہ اگرچہ اپنے پڑوسی ممالک کی جانب سے حق ملکیت کے حوالے سے متنازعہ قرار دیا جا چکا ہے۔ تاہم عالمی سطح پر اسے ابھی بھی انگولا ہی کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ صوبے کابندا کے اندر مقامی افراد کی جانب سے آزادی کی تحریک کافی فعال ہے اور گذشتہ چار دہائیوں سے یہاں پر امن و امان کی صورت حال ابتر تھی۔ تاہم دو ہزار چھے میں اقوام متحدہ اور دیگر یورپی اور افریقی ممالک کی جانب سے کرائے جانے والے امن معاہدے کے بعد امن و امان کی صورت حال میں بہتری آئی ہے۔ (سنڈے ایکسپریس یکم نومبر 2015)

وہ ملک جو دوسرے ملک میں واقع ہیں

☆ ویٹی کن سٹی اسٹیٹ۔ اٹلی (Vatican City)

رقبے اور آبادی کے لحاظ سے دنیا کے سب سے چھوٹے ملک کا اعزاز رکھنے والا ویٹی کن سٹی اسٹیٹ اٹلی کے دارالحکومت روم میں واقع ہے۔ اس خودمختار ریاست کی آبادی محض آٹھ سو چالیس نفوس پر مشتمل ہے، جب کہ رقبہ صفر اعشاریہ چوالیس مربع کلو میٹر ہے۔ کیتھولک عیسائیوں کے لیے مرکزی مقام کی حیثیت رکھنے والی یہ ریاست اُنیس سو اُنتیس میں قائم کی گئی۔ ویٹی کن سٹی میں عیسائیوں کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا کی رہائش گاہ بھی ہے، جو ریاست کے سربراہ بھی ہوتے ہیں۔ خوب صورت مجسموں، فواروں اور رنگ برنگے پھولوں سے سجی یہ ریاست چاروں جانب دیواروں سے گھری ہوئی ہے۔ اٹلی کی حدود میں واقع ہونے کے باعث ویٹی کن سٹی کے دفاع کی ذمہ داری اٹلی کے پاس ہے۔

☆ سان مارینو۔ اٹلی (San Marino)

سان مارینو ایک مستری کی بسائی ہوئی بستی ہے، جو ایک خودمختار ملک کا درجہ رکھتی ہے۔ سان مارینو کا محل وقوع بھی اٹلی میں ہے اور یہ ملک بھی چاروں جانب سے اٹلی کی سرزمین سے گھرا ہوا ہے۔ سن تین سو ایک میں مارینوس نام کے ایک مستری کے ہاتھوں قائم ہونی والی اس ریاست کے بارے میں مقامی افراد کا دعویٰ ہے کہ یہ دنیا کی سب سے قدیم آباد جمہوری ریاست ہے۔ اکسٹھ مربع کلومیٹر پر محیط یہ ریاست دنیا کی تیسری سب سے چھوٹی ریاست میں شمار کی جاتی ہے، جس کی آبادی تقریباً ساڑھے بتیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ اٹلی کے شمال مشرقی پہاڑی سلسلے ایمیلیا رومانیا اور مارکے ریجن میں واقع جمہوریہ سان مارینو میں فوج نہیں ہے اور اس کے دفاع کی ذمہ داری بھی اٹلی کی افواج کرتی ہیں۔

☆ لیسوتھو۔ جنوبی افریقہ (Lesotho)

جنوبی افریقہ کی حدود میں واقع یہ ملک بنیادی طور پر کنگڈم آف لیسوتھو کہلاتی ہے اور یہاں پر آئینی بادشاہت قائم ہے۔ تیس ہزار مربع کلومیٹر کے رقبے اور بیس لاکھ نفوس پر مشتمل آبادی والے ملک لیسوتھو کے اطراف میں جنوبی افریقہ کے شہر پیٹر مارتیز برگ اور بلومفونٹین واقع ہیں۔ لیسوتھو کی عوام نے چار اکتوبر اُنیس سو چھیاسٹھ کو برطانیہ سے آزادی حاصل کی اس سے قبل لیسوتھو کو باسٹولینڈ کہا جاتا تھا، اگرچہ یہاں کی چالیس فی صد عوام خطِ افلاس سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ تاہم حکومت کی جانب سے تعلیم کے شعبے پر بہت توجہ دی گئی ہے، جس کے نتیجے میں چودہ سال سے زاید عمر کے افراد میں شرح خواندگی پچاسی فی صد تک ہوگئی ہے، جو شرح خواندگی کے حوالے سے براعظم افریقہ کے ممالک میں سب سے زیادہ ہے۔ لیسوتھو کو جغرافیائی لحاظ سے ایک امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ یہ دنیا کا واحد ملک ہے، جو مکمل طور پر سطح سمندر سے ایک ہزار میٹر بلند ہے۔ تاہم دوسری طرف بدقسمتی سے لیسوتھو میں دنیا بھر میں ایڈز کے مریضوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، جسے یہاں کی حکومت اقوام متحدہ اور دیگر تنظیموں کی مدد سے کم کرنے کی کوشش میں مصروف عمل ہے۔ دوسرے ملک سے گزرنا لازمی وہ علاقے جن کی سرحدیں اپنے ملک سے جڑی ہوئی تو ہیں لیکن وہاں داخل ہونے کے لیے دوسرے ملک کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

☆ اس ڈی سیوس۔ اسپین (Os de Civís)

اس ڈی سیوس گاؤں اسپین کے وسطی پہاڑی سلسلے پیرنیس میں واقع ہے۔ دشوار گزار پہاڑوں اور گھاٹیوں کے باعث اس گاؤں میں داخل ہونے یا نکلنے کا واحد راستہ ایک دوسرے چھوٹے سے پڑوسی ملک انڈورا سے ہے۔ سو نفوس پر مشتمل اس ڈی سیوس گاؤں سطح سمندر سے سات ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس گاؤں میں

موجود قدیم تاریخی عمارتیں سیاحوں کے لیے دل چسپی کا سامان ہیں۔

☆ جنگ ہولز اور کلینول سیر تال۔ آسٹریا

Jungholz and Kleinwalsertal, Austria

یہ دونوں علاقے اگرچہ آسٹریا کے ضلع ریوٹے کی حدود میں شامل ہیں مگر خطرناک پہاڑی سلسلوں اور ذرائع نقل وحمل کے فقدان کے باعث ان دونوں علاقوں میں داخل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ جرمنی کے راستے سے داخل ہوا جائے۔ تین سو کی آبادی والے جنگ ہولز اور پانچ ہزار نفوس پر مشتمل کلینول سیر تال قدرتی حسن سے مالا مال علاقے ہیں، جہاں سال بھر سیاحوں کا ہجوم لگا رہتا ہے۔

(سنڈے ایکسپریس یکم نومبر 2015)

۲۱ ویں صدی کی چند اہم ایجادات

مامور احمد

ایپل آئیپوڈ 2001ء:

ایم پی تھری پلییرز تو دنیا میں کافی عرصے سے موجود ہیں، مگر ایپل نے 2001ء میں اس کا اپنا ورژن آئی پوڈ متعارف کرایا، جس میں آئی ٹیون سافٹ ویئر کو شامل کیا گیا تھا، تو اس نے ایک تہلکہ مچا کر رکھ دیا۔ اس ٹیکنالوجی نے موسیقی سننے کیلئے لوگوں کے طرز فکر کو بدل کر رکھ دیا، خاص طور پر اس ڈیوائس میں گانوں کی سٹوریج کی بہت زیادہ گنجائش نے سی ڈیز یا کیسٹس کو ختم کر کے رکھ دیا۔

موزیلا فائرفوکس 2002ء:

فائرفوکس پہلا ویب براؤزر تھا، جس نے مائیکروسافٹ کے انٹرنیٹا یکسپلورر کی بالادستی کو چیلنج کیا۔ فائرفوکس مفت اور اوپن سورس براؤزر تھا، جس نے ونڈوز کے صارفین کو اپنی جانب متوجہ کیا، تاہم اب گوگل کے کروم براؤزر نے اس کی مقبولیت کو کم کر دیا ہے۔

سکائپ 2003ء:

سکائپ نے مختلف ممالک کے لوگوں کے درمیان رابطے کے انداز کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا اور اس کے ذریعے بیرون ملک بات کرنا بلکہ ویڈیو کال کرنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ سب سے خاص بات وائی فائی کی بدولت یہ کسی مہنگی فون کال کے مقابلے میں مفت بات چیت کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ آغاز میں سکائپ صرف ڈیسک ٹاپ کمپیوٹرز کے لئے ہی دستیاب تھا، مگر وقت گزرنے کے ساتھ اسے موبائل فونز کیلئے بھی متعارف کرایا گیا اور اب یہ رابطے کیلئے مقبول ترین ذرائع میں سے ایک ہے۔

فیس بک 2004ء:

فیس بک دنیا کا پہلا سوشل نیٹ ورک نہیں تھا بلکہ یہ ماضی کی سائٹس جیسے مائی اسپیس وغیرہ کی کامیابی کو مدنظر رکھ کر تیار کیا گیا تھا، تاہم اس نے اپنے آسان فیچرز کی بدولت سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ آغاز میں یہ یونیورسٹی کے طالب علموں کی لئے دستیاب تھا مگر آج یہ ویب سائٹ پوری دنیا سے ایک ارب تیس کروڑ سے زائد لوگوں کو اپنے ساتھ جوڑے ہوئے ہے۔

یوٹیوب 2005ء:

اس سائٹ کو پے پال کے تین سابقہ ملازمین نے مل کر تیار کیا تھا اور یہ اب دنیا کی مقبول ترین ویڈیو شیئرنگ ویب سائٹ ہے۔ اس کی کامیابی کی کنجی دنیا کے ہر شخص کو مفت میں اپنے خیالات کا بذریعہ ویڈیو اظہار کرنے کا موقع فراہم کرنا ہے، جس کے نتیجے میں یہ سائٹ نیوز اپ ڈیٹس، سیاسی پیغامات، میوزک ویڈیوز، پر مزاح فوحر پر مشتمل ہے۔

نانٹینڈ ڈی وی یو 2006ء

2006ء میں نانیٹ یٹڈ وی یو نے ایک ایسا کنسول متعارف کرایا، جس کے ذریعے صارفین کو ورچوئل گیمز میں جسمانی طور پر کھیلنے کا تجربہ ہوا۔ اس کنسول کا کنٹرولر صارف کی حرکت کو تھری ڈی کے ذریعے ڈیٹیکٹ کرتا تھا اور اب اسے ایک فٹنس ڈیوائس کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔

ایپل کا آئی فون 2007ء:

ایپل کا آئی فون ایپل کا آئی فون پہلا ٹچ سکرین سمارٹ فون تھا، جس نے دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اس کی مقبولیت کی وجہ اس کو ہاتھوں کی انگلیوں سے کنٹرول کرنا تھا۔ اس کے بعد ہر کمپنی نے ٹچ سکرین ٹیکنالوجی پر مشتمل اپنے ماڈلز متعارف کروائے۔

گوگل اینڈرائیڈ 2008ء:

ایپل کی جانب سے 2007ء میں آئی فون متعارف کرائے جانے کے بعد دیگر موبائل کمپنیاں اس مارکیٹ میں اپنا حصہ حاصل کرنا چاہتی تھیں، مگر انہیں ایسے آپریٹنگ سسٹم کی ضرورت تھی، جو ایپل کا مقابلہ کر سکے۔ گوگل کی جانب سے اینڈرائیڈ متعارف کرائے جانے کے بعد یہ سام سنگ، سونی، ایل جی اور ایچ ٹی سی جیسی کمپنیوں کے سمارٹ فونز کیلئے مرکزی آپریٹنگ سسٹم بن چکا ہے اور دنیا بھر میں یہ مارکیٹ شیئر 80 فی صد سے زیادہ حصہ اپنے نام کئے ہوئے ہے۔

ایپل آئی پیڈ 2010ء:

ایپل نے 2010ء میں اپنا پی سی ٹیبلٹ آئی پیڈ متعارف کرا کے ایک

بار پھر میدان مار لیا۔ یہ اپنی طرز کی پہلی ڈیوائس نہیں تھی، ایپل کے آئی پیڈ کو سب سے مقبول ترین ٹیبلیٹ کا اعزاز حاصل ہے۔

آئی بی ایم واٹسن 2011ء:

آئی بی ایم واٹسن مصنوعی ذہانت سے لیس کمپیوٹر سسٹم ہے، جو مختلف انسانی زبانوں کے سوالات کے جوابات دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ سال 2011ء میں اس کی آزمائش ایک امریکی کوئز شو میں ہوئی اور اس نے دو سب سے بہترین چیمپینز کو شکست دیدی۔

گوگل بغیر ڈرائیور گاڑی 2014ء:

رواں سال کے شروع میں ان گاڑیوں کی کیلی فورنیا میں کامیاب آزمائش کی گئی۔ یہ گاڑیاں باقاعدہ طور پر 2017ء تک فروخت کیلئے پیش کی جائیں گی، جن کی سب سے زیادہ رفتار 25 میل فی گھنٹہ ہے اور یہ ٹریفک کے ہجوم میں بھی بغیر ڈرائیور کے چلنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

(روزنامہ دنیا 20 نومبر 2015ء)

دہشت گردی کا ذمہ دار صرف مولوی ہے

وجاہت علی خان مکتوب لندن

انتہا پسندی، جنونیت، وحشت، ایک ہی قسم کے مائنڈ سیٹ کے حاملین کی مختلف منازل ہیں جو دہشت گردی کی آخری منزل پر منتج ہوتی ہیں اور اس کی تمام تر ذمہ داری کسی ایک خاص فرقہ یا گروہ پر عائد نہیں ہوتی بلکہ بحیثیت معاشرہ ہر فرد اس کے فروغ میں برابر کا حصہ دار ہے۔ برطانیہ میں دولت مشترکہ کے تقریباً سبھی ممالک سے آنے والے آباد کار گزشتہ 60 سال سے یہاں آکر سیٹل ہو رہے ہیں اور یہاں انہیں ویلکم بھی کیا جاتا ہے لیکن سب سے زیادہ جس کمیونٹی سے مقامی حکومتوں کو مسائل کا سامنا ہے وہ مسلمان کمیونٹی ہے۔ کبھی ان کے حجابوں کا مسئلہ ہے، کبھی نقاب کا اور کبھی مساجد میں انتہا پسندی کو فروغ دینے کا معاملہ زیر بحث آتا ہے۔ اس کے علاوہ جب کبھی منشیات سمگلنگ یا اس کی خرید و فروخت یا عصمت دری کا کوئی واقعہ سامنے آئے تو اس کے پیچھے بھی زیادہ تر واقعات میں پاکستان یا مسلمان کمیونٹی کے کسی فرد کا ہاتھ سامنے آتا ہے۔ 7 جولائی 2005ء کو لندن میں دہشت گردی کا واقعہ ہوا تو تحقیقات کے بعد اس کے پیچھے بھی حسیب حسین، صادق خان اور شہزاد تنویر کے نام سامنے آئے۔ مختلف ادوار میں آنے والی برطانوی حکومتیں اس سلسلہ میں ڈھکے چھپے انداز میں تنبیہ کرتی ہیں تاکہ مسلمان کمیونٹی کو دیگر لوگوں کی طرف سے کسی خطرے کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اب برطانیہ میں جس نئے فتنے نے سر اٹھایا ہے وہ انتہا پسند مسلمان نوجوانوں کا ہی نہیں بلکہ پوری کی پوری فیملیوں کا شام جانا اور نام نہاد اسلامی سٹیٹ کیلئے جہاد کرنا ہے۔ یہ ایک ایسا خطرہ ہے جس نے برطانیہ کے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ہائی الرٹ کر دیا ہے کیونکہ شام جانے والے مسلمان برطانوی شہری ہیں جو معاشرے کیلئے سنگین خطرات پیدا کر سکتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ دیگر مذاہب کی نسبت مسلمانوں کے اندر انتہا پسندی یا مذہبی جنونیت زیادہ ہے؟ پاکستان میں بھی اس رجحان پر ان دنوں بڑی شدومد کے ساتھ مباحثے جاری ہیں کہ کیا ملک سے دہشت گردی کا خاتمہ ہو چکا یا جلد ہو جائے گا؟ اس ضمن میں مختلف آراء سننے میں آرہی ہیں لیکن میرے تجزیئے کے مطابق ایسا ہونا کم از کم آئندہ نصف صدی تک تو ممکن نہیں۔ اس کی وجوہات پاکستان کی حد تک تو یوں ہیں کہ پچھلے تقریباً 40 سال سے ہم نے پاکستان میں انتہا پسندی کی جو فصلیں بڑے چاؤ اور رساؤ سے بوئی ہیں انہیں کاٹنے میں ابھی طویل وقت لگے گا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے دہشت گردی یا انتہا پسندی کے خاتمہ کیلئے ابھی پہلا قدم ہی نہیں اٹھایا، یہ ''ضرب عضب'' وغیرہ تو اصل میں پہاڑوں یا ویرانوں میں چھپے دہشت گردوں کی قلیل تعداد کو ختم کرنے کیلئے جاری ہے لیکن دہشت گردی کے خاتمہ یا ملک کی ہر گلی، محلے میں پروان چڑھ رہی انتہا پسندی کی بیخ کنی کیلئے تو ابھی سوچا بھی نہیں گیا، اس لئے آنے جانے والی حکومتوں کو تو چھوڑ دیجئے پاکستان میں بسنے والا ہر مذہبی انسان غیر محسوس طریقے سے بھی انتہا پسندی و جنونیت کو دہشت گردی تک پہنچانے کا براہ راست ذمہ دار ہے، یعنی عمل پیدائش کے بعد نکاح، مردہ نہلانے اور جنازے پڑھانے تک کا کام جب سے ہم نے مولوی کے سپرد کر رکھا ہے، ہم اسے روٹی، کپڑا اور مکان کی کمی نہیں آنے دیتے۔ ہم اس کی کسی بھی الٹی سیدھی مذہبی تاویلات پر نہ نوٹس لیتے اور نہ قدغن لگاتے ہیں۔ مولوی جب مساجد میں بیٹھ کر سیاست کرتا ہے، عقیدہ پرستی کو ہوا اور جذبہ جہاد کو جلا دیتا ہے تو اس کی زبان کوئی نہیں روکتا۔ وہ ہر شہر، قصبہ و دیہات کی گلی میں دھڑا دھڑ تعمیر ہونے والی مساجد میں ہماری نوجوان نسل کو تحمل، برداشت، رواداری، اخوت، محبت اور امن و آشتی کے اسباق کی بجائے نفرت اور جنگ و جدل کی تربیت دیتا ہے تو کوئی ملکی قانون اور ریاستی طاقت اس کی زبان نہیں روکتی۔ یہی مولوی ریاست کے اس حکم کو بھی ہوا میں اڑا دیتا ہے کہ لاؤڈ سپیکر کا استعمال اذان کے علاوہ بے جا نہ کیا جائے، تو اس کی اس قانون شکنی کو بھی ''حسینہ کی ادا'' جان کر قانون حرکت میں نہیں آتا، تو پھر تصور کیجئے کہ نوجوانوں کی جو کھیپ اس کم علم مولوی کی سوچ بوجھ لے کر نکلے گی، ان چلتے پھرتے انتہا پسندوں اور خودکش بمباروں کو کس طاقت میں دم ہے کہ روک سکے؟ یہی نوجوان مسجد سے نکل کر اعلیٰ تعلیم کیلئے ملک بھر میں کھمبیوں کی طرح اُگے مدرسوں میں جا پہنچتے ہیں، پھر یہی قوم کے معصوم بچے حوروں اور جنت میں جاری چشموں کی

خواہش میں اپنی قیمتی جانوں سے گزر جاتے ہیں اور طرفہ تماشا یہ کہ دونوں طرف سے مارے جانے والے ہمارے اپنے ہی شہید ہوتے ہیں!!

پاکستان میں پنپ چکا عمومی مذہبی رجحان جب نوجوانوں کو عمل کی بجائے عقیدے کی موشگافیوں میں اُلجھائے رکھے گا تو معاشرے میں ترقی وتعمیر کا عمل تو رُکے گا ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ معاشرتی جمود شفاف و کھلے ذہن کی راہ کی دیوار بن جائے گا کیونکہ فی الوقت پاکستانی معاشرے کی بنیاد ایک معکوسی اصول پر قائم ہے اور وہ یہ کہ عوام کی ایک بڑی تعداد جذبہ اطاعت گزاری سے مزین ہے، اسے جس طرف چاہو ہانک کر لے جاؤ لیکن ان میں تقریباً دس فیصد ایسے بھی ہیں جن پر حکمرانی کا بھوت سوار ہوتا ہے، وہ کسی نہ کسی رنگ میں لیڈر بننا چاہتے ہیں۔ اس قماش کے لوگوں کو اپنے عوام کی فلاح و بہبود اور تربیت سے کوئی غرض نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے اقتدار کی مضبوطی و طوالت کیلئے مقید و بند دماغوں والے ریوڑ ہی پروان چڑھانا چاہتے ہیں، یہ لوگ کبھی تو رُوحانی وسیاسی روپ میں ظاہر ہوتے ہیں تو کبھی عسکری اور اقتصادی لباس میں، لہٰذا اگر کوئی رحم دل حاکم پاکستان میں دہشت گردی کا حقیقی خاتمہ چاہتا ہے تو سب سے پہلے اسے ریاستی رٹ کے ذریعے عقائد کی انتہا پسندی کی روش کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ مسجدوں و مدرسوں کے مولوی کو حدود و قیود کا پابند اور ان کے نصاب کو حکومتی پالیسی کے مطابق بنانا ہوگا اور مہذب ملکوں کی طرح مذہبی اور ریاستی معاملات کو الگ کرنا ہوگا اور دینی واعظوں کے ہر ایک لفظ پر کڑی نگاہ رکھنا ہوگی، تب ہوسکتا ہے کہ آنے والی دو دہائیوں میں ایک صاف ستھرا معاشرہ پاکستان کے عوام کو میسر آسکے۔ موجودہ حالت تو یہ ہے کہ شتر بے مہار اور بے جادہ ومنزل اس قوم کے سامنے کوئی سمت نہیں ہے۔ اثر انداز ہونے والا ایک مخصوص طبقہ ملکی ثمرات پر بُری طرح قابض ہے۔ اس خاص طبقہ کو مذہبی انتہا پسندی پوری طرح سوٹ کرتی ہے کیونکہ لوٹ کھسوٹ کیلئے ایسا ہی سسٹم سودمند ہوتا ہے ورنہ یقیناً کھلا ذہن اور صاحب الرائے شخص تو سوال کرتا ہے اور سوال بہرحال اس مخصوص طبقہ کی عیش کوشی کیلئے زہر قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں جب ملک میں اخلاقی قدروں کو پامال ہوتے دیکھتا ہوں اور روزانہ اس احساس سے گزرتا بھی ہوں کہ میرے لئے ایمانداری، صاف گوئی، کم مائیگی اور دانشوری کس طرح میری پشیمانی کا باعث بن جاتی ہے اور کس طرح سے مجھے اپنی حساسیت اور سنجیدہ روی کے ساتھ لندن جیسے شہر میں بھی زندہ رہنا مشکل ہوجاتا ہے، مجھے بارہا پاکستانی احباب کی طرف سے یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ جو پیمانہ جھوٹ، مکروفریب، نفسانفسی، اخلاق باختگی اور بدکرداری میں بری طرح دھنسی ہوئی ہماری سوسائٹی تمہیں دیتی ہے تم احتجاج کیے بغیر موم کی طرح اس پیمانے میں فٹ ہوجاؤ ورنہ تم سوچ لو کہ ریاست وحکومت سے تو تم ٹکر لے سکتے ہو لیکن بند ذہن معاشرے سے لڑنا اور اس کے درمیان رہ کر زندگی گزارنا تمہارے لئے ممکن نہیں ہوگا۔ لہٰذا ان حالات میں مجھے اپنا چولہا گرم رکھنے کیلئے خلاف ضمیر سمجھوتے کرنا پڑے ہیں۔ میرے جیسا لبرل خیالات رکھنے والا بھی بے بس ومجبور ہوجاتا ہے۔ آج جس طرح سے سیاست و صحافت دولت کمانے کا ایک معروف ترین ہتھیار بن چکے ہیں اور جس طرح سے اعلیٰ طبقہ کے افراد قانون سے بالاتر ہوچکے ہیں، ایسے ماحول میں کسی کو فرصت ہی نہیں کہ ملک میں سرعام جاری انتہا پسندی ودہشت گردی کے بڑھتے ہوئے عفریت کی بیخ کنی کیلئے آواز اٹھائے۔ صورتحال کچھ یوں بن چکی ہے کہ مذہبی انتہا پسندی کے علاوہ جو عمومی رویئے بھی اعتدال پسند نہیں رہے ''دیہاڑی دار حکمران'' ایک ہجوم کو اعتدال پسند قوم بنانے کی سعی تو نہیں اپنے اقتدار کی بنیادیں مضبوط تر بنانے کیلئے شب و روز غلطاں ہیں اور مغل بادشاہ ظہیرالدین بابر کی طرح ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کی آرزو رکھتے ہیں!

انتونی لائزنٹ لاوزئر
فرانسیسی سائنسدان اور جدید کیمیا کا بانی

عامر سہیل

یہ عظیم فرانسیسی سائنسدان 1743ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ لاوزیئر نے قانون کی تعلیم حاصل کرکے نوجوانی میں ہی فرانسیسی وکلاء کی انجمن میں شمولیت اختیار کر استعمال کرلی تھی۔ اس نے اپنی قانونی تعلیم کا عملی داریاں نبھانے اور کی بجائے ہمیشہ انتظامی ذمہ عوامی خدمت میں مصروف رہنے کو ترجیح دی۔ وہ ''فرنچ رائل اکیڈمی آف سائنسز'' میں فعال ہونے کے ساتھ ساتھ محصولات وصول کرنے والے ایک ادارے Ferme Genrale کا بھی ایک رکن تھا۔ انتونی لاوزیئر ایک دواساز تھا۔ اس نے دریافت کیا کہ ہوا میں آکسیجن کی موجودگی کی وجہ سے بہت سے عناصر میں کیمیائی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اگرچہ 1754ء سے 1774ء تک تک پریسلے اور جوزف بلیک جیسے قابل کیمیادان آکسیجن اور ہائیڈروجن سمیت کئی گیسوں کو دریافت کرچکے تھے۔ انتونی کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے عہد کے تصورات کو تحقیق کے بعد قابل قبول اور ناقابل قبول میں تقسیم کرکے علم کیمیا کو درست تحقیقی اور تجرباتی راستے پر ڈالا۔ اس نے مفروضاتی آتشی عنصر کے نظریے کو باطل قرار دیتے ہوئے کہا کہ افروختگی کا عمل جلتے ہوئے مادے کے آکسیجن کے ساتھ کیمیائی اشتراک پر مبنی ہوتا ہے۔ اس نے ہوا اور پانی کے بنیادی عنصر ہونے کو بھی جھٹلایا اور انکشاف کیا کہ پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن جبکہ آگ بنیادی طور پر آکسیجن اور نائٹروجن کا مرکب یا آمیزہ ہے۔ لاوزیئر نے اپنے نظریات کو 1789ء میں کتابی صورت میں پیش کردیا۔ اس کی شاندار کتاب ''کیمیا کے عناصر'' نے نوجوان کیمیادانوں کی نئی نسل کو جلد ہی اس سے متفق ہونے پر مجبور کردیا۔ اس نے مرکبات کے نظام آمیزش پر بھی

بہت کام کیا۔اس کی یہ دریافتیں جدید کیمیا دانی کیلئے بہت مؤثر ثابت ہوئیں۔انقلاب فرانس کے بعد نئی حکومت کیلئے انتونی لاوزیئر قابل اعتبار نہ تھا۔لہٰذا جلد ہی انقلابی حکومت نے ''فرمی جنریل'' کے 27 دیگر ارکان کے ہمراہ انتونی لاوزیئر کو بھی حراست میں لے لیا۔1794ء میں مقدمہ کے دوران انتونی لاوزیئر کی طرف سے معافی کی درخواست دی گئی جس میں ملک اور سائنس کے لئے اس کی گرانقدر خدمات کا تفصیلی ذکر تھا لیکن انقلابی حکومت کے تیز رفتار نظام عدل وانصاف پر اس درخواست کا کوئی اثر نہ ہوا اور جج نے اسے یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا کہ جمہوریہ کو فطین وذہین لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔1794ء میں انتونی لاوزیئر کو پھانسی دیدی گئی۔اس ''عظیم مقتول'' کو ''جدید کیمیا کا باپ'' کہا جاتا ہے۔سائنس کی تاریخ میں انتونی لاوزیئر ایک نمایاں باب کے طور پر ہمیشہ زندہ رہیگا۔ (شخصیات کا انسائکلو پیڈیا)

دھوبی کا بیٹا۔ رجل خوشاب

حضرت نظام الدین اولیاء اکثر ایک جملہ کہا کرتے تھے کہ ''ہم سے تو دھوبی کا بیٹا ہی خوش نصیب نکلا، ہم سے تو اتنا بھی نہ ہوسکا''۔پھر غش کھا جاتے۔ایک دن ان کے مریدوں نے پوچھ لیا کہ حضرت یہ دھوبی کے بیٹے والا کیا ماجرا ہے؟ آپ نے فرمایا ایک دھوبی کے پاس محل سے کپڑے دھلنے آیا کرتے تھے اور وہ میاں بیوی کپڑے دھو کر پریس کر کے واپس محل پہنچا دیا کرتے تھے، ان کا ایک بیٹا بھی تھا جو جوان ہوا تو کپڑے دھونے میں والدین کا ھاتھ بٹانے لگا، کپڑوں میں شہزادی کے کپڑے بھی تھے، جن کو دھوتے دھوتے وہ شہزادی کے نادیدہ عشق میں مبتلا ہوگیا۔محبت کے اس جذبے کے جاگ جانے کے بعد اس کے اطوار تبدیل ہوگئے، وہ شہزادی کے کپڑے الگ کرتا انہیں خوب اچھی طرح دھوتا، انہیں استری کرنے کے بعد ایک خاص نرالے انداز میں تہہ کر کے رکھتا، سلسلہ چلتا رہا آخر والدہ نے اس تبدیلی کو نوٹ کیا اور دھوبی کے کان میں کھسر پھسر کی کہ یہ تو لگتا ہے سارے خاندان کو مروائے گا، یہ تو شہزادی کے عشق میں مبتلا ہوگیا ہے۔والد نے بیٹے کے کپڑے دھونے پر پابندی لگا دی، ادھر جب تک لڑکا محبت کے زیر اثر محبوب کی کوئی خدمت بجا لاتا تھا، محبت کا بخار نکلتا رہتا تھا، مگر جب وہ اس خدمت سے ہٹایا گیا تو لڑکا بیمار پڑ گیا اور چند دن کے بعد فوت ہوگیا۔ادھر کپڑوں کی دھلائی اور تہہ بندی کا انداز بدلا تو شہزادی نے دھوبن کو بلا بھیجا اور اس سے پوچھا کہ میرے کپڑے کون دھوتا ہے؟ دھوبن نے جواب دیا کہ شہزادی عالیہ میں دھوتی ہوں، شہزادی نے کہا پہلے کون دھوتا تھا؟ دھوبن نے کہا کہ میں ہی دھوتی تھی، شہزادی نے اسے کہا کہ یہ کپڑا تہہ کرو، اب دھوبن سے ویسے تہہ نہیں ہوتا تھا۔شہزادی نے اسے ڈانٹا کہ تم جھوٹ بولتی ہو، سچ سچ بتاؤ ورنہ سزا ملے گی، دھوبن کے سامنے کوئی رستہ بھی نہیں تھا دوسرا کچھ دل بھی غم سے بھرا ہوا تھا، وہ زار وقطار رونے لگ گئی، اور سارا ماجرا شہزادی سے کہہ دیا، شہزادی یہ سب کچھ سن کر سناٹے میں آ گئی۔پھر اس نے سواری تیار کرنے کا حکم دیا اور شاہی بگھی میں سوار ہو کر پھولوں کا ٹوکرا بھر کر لائی اور مقتول محبت کی قبر پر سارے پھول چڑھا دیے، زندگی بھر اس کا یہ معمول رہا کہ وہ اس دھوبی کے بچے کی برسی پر اس کی قبر پر پھول چڑھانے ضرور آتی۔یہ بات سنانے کے بعد کہتے، اگر ایک انسان سے بن دیکھے محبت ہوسکتی ہے تو بھلا اللہ سے بن دیکھے محبت کیوں نہیں ہوسکتی؟ ایک انسان سے محبت اگر انسان کے مزاج میں تبدیلی لاسکتی ہے اور وہ اپنی پوری صلاحیت اور محبت اس کے کپڑے دھونے میں بروئیکار لاسکتا ہے تو کیا ہم لوگ اللہ سے اپنی محبت کو اس کی نماز پڑھنے میں اسی طرح دل وجان سے نہیں استعمال کر سکتے؟ مگر ہم بوجھ اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر شہزادی محبت سے تہہ شدہ کپڑوں کے انداز کو پہچان سکتی ہے تو کیا رب کریم بھی محبت سے پڑھی گئی نماز اور پیچھا چھڑانے والی نماز کو سمجھنے سے عاجز ہے؟ حضرت نظام الدین اولیاء پھر فرماتے وہ دھوبی کا بچہ اس وجہ سے کامیاب ہے کہ اس کی محبت کو قبول کر لیا گیا جبکہ ہمارے انجام کا کوئی پتہ نہیں قبول ہوگی یا منہ پر ماردی جائے گی، اللہ جس طرح ایمان اور نماز روزے کا مطالبہ کرتا ہے اسی طرح محبت کا تقاضا بھی کرتا ہے، یہ کوئی مستحب نہیں فرض ہے! مگر ہم غافل ہیں۔پھر فرماتے اللہ کی قسم اگر یہ نمازیں نہ ہوتیں تو اللہ سے محبت کرنے والوں کے دل اسی طرح پھٹ جاتے جس طرح دھوبی کے بچے کا دل پھٹ گیا تھا، یہ ساری ساری رات کی نماز ایسے ہی نہیں پڑھی جاتی کوئی جذبہ کھڑا رکھتا ہے، فرماتے یہ نسخہ اللہ پاک نے اپنے نبی کے دل کی حالت دیکھ کر بتایا تھا کہ آپ نماز پڑھا کیجئے اور رات بھر ہماری باتیں دہراتے رہا کیجئے آرام ملتا رہے گا۔اسی وجہ سے نماز کے وقت آپ فرماتے تھے ''ارحنا بلال۔اے بلال ہمارے سینے میں ٹھنڈ ڈال دے اذان دے کر''

اللہ کا فضل۔الف ن

مجھ پر اللہ کا بڑا فضل ہے کہ میرا ذاتی مکان ہے، گاڑی ہے، میری مختلف ذرائع سے آمدنی پچاس ہزار سے لیکر لاکھ روپے تک ہوجاتی ہے اور بعض دفعہ اس سے بھی بڑھ جاتی ہے، مجھ پر اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اس نے مجھے اولاد کی نعمت سے نوازا ہے، جو اچھی تعلیم حاصل کر رہی ہے، میرے گھر میں استعمال کی ہر چیز ہے اور میری ضروریات زندگی بڑے اچھے طریقے سے پوری ہو رہی ہیں جو میں سمجھتا ہوں کہ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے، اللہ کے فضلوں میں سے ایک بہت بڑا فضل یہ ہے کہ ایک خطیر رقم ہر وقت میرے پاس ہتی ہے جو دکھ سکھ اور ایمرجنسی میں میرے کام آتی ہے اور اللہ کا بڑا فضل

ہے کہ میں کسی کا محتاج نہیں، غرضیکہ میرے پاس دنیاوی نعمتیں ہیں اور مجھ پر اللہ کا بڑا فضل ہے، لیکن میں بعض دفعہ سوچتا ہوں کہ مجھ پر اللہ کا یہ فضل کیوں نہیں ہے کہ عبادات بجالاؤں؟۔نماز ادا کرسکوں، تلاتِ قرآن کریم کرسکوں، خدا کی راہ میں ایک شرح کے مطابق خرچ کرسکوں، مجھ پر اللہ کا یہ فضل کیوں نہیں اپنے ہمسایہ یا کسی غریب کی مدد کرسکوں؟۔میں اپنے ایسے دوستوں یا عزیزوں کو اچھی طرح جانتا ہوں جو زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم ہیں، بلکہ انکی روٹی بھی بمشکل پوری ہوتی ہے لیکن مجھ پر اللہ کا یہ فضل نہیں کہ انکی کچھ مدد کرسکوں، باقی مجھ پر اللہ کے بڑے فضل ہیں جن کا میں اکثر اظہار کرتا رہتا ہوں کہ مجھ پر اللہ کے بڑے فضل ہے، لیکن آخر یہ مجھ پر اللہ کے فضل دنیاوی کیوں ہیں؟ روحانی کیوں نہیں؟ کبھی کبھی مجھے میرے اندر سے آواز آتی ہے کہ جو دنیاوی چیزیں اللہ کی یاد، اسکے خوف، اسکی عبادات، اسکی مخلوق، غرباء اور مساکین کی مدد سے غافل کردیں وہ اللہ کا فضل نہیں۔

شکر۔اپنے رب کا شکر ادا کرو

عاصی صحرائی

اگر قارون کو بتا دیا جائے کہ آپکی جیب میں رکھا اے ٹی ایم کارڈ اس کے خزانوں کی ان چابیوں سے زیادہ مفید ہے جنہیں اس کے وقت کے طاقتور ترین انسان بھی اٹھانے سے عاجز تھے تو قارون پر کیا بیتے گی؟ اگر کسریٰ کو بتا دیا جائے کہ آپ کے گھر کی بیٹھک میں رکھا صوفہ اس کے تخت سے کہیں زیادہ آرام دہ ہے تو اس کے دل پر کیا گزرے گی؟ اور اگر قیصر روم کو بتا دیا جائے کہ اس کے غلام شتر مرغ کے پروں سے بنے جن پنکھوں سے اسے جیسی اور جتنی ہوا پہنچایا کرتے تھے آپ کے گھر کے درمیانہ سے سپلٹ اے سی کے ہزارویں حصے کے برابر بھی نہیں تھی تو اسے کیسا لگے گا؟

آپ اپنے پرانی سی کرولا کار لیکر ہلاکو خاں کے سامنے فراٹے بھرتے ہوئے گزر جایئے، کیا اب بھی اس کی اپنے گھوڑوں پر سواری کا تکبر اور نخوت برقرار رہی ہوگی؟ ہر قل خاص مٹی سے بنی صراحی سے ٹھنڈا پانی لیکر پیتا تھا تو دنیا اس کی اِس آسائش پر حسد کیا کرتی تھی۔تو اگر اسے اپنے گھر کا کولر دکھا دے تو وہ کیا سوچے گا؟ خلیفہ منصور کے غلام اس کیلئے ٹھنڈے اور گرم پانی کو ملا کر غسل کا اہتمام کرتے تھے اور وہ اپنے آپ میں پھولا نہیں سمایا کرتا تھا، کیسا لگے گا اسے اگر وہ تیرے گھر میں بنی جاکوزی دیکھ لے تو؟ اونٹوں پر سوار ہوکر حج کیلئے گھر سے نکلتے تھے اور مہینوں میں پہنچتے تھے اور آج تو چاہے تو جہاز میں سوار چند گھنٹوں میں مکہ پہنچ سکتا ہے۔ان لیجئے کہ آپ بادشاہوں کی سی راحت میں ہی نہیں رہ رہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ بادشاہ آپ جیسی راحت کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔مگر کیا کیجئے کہ آپ سے تو جب بھی ملیں اپ اپنے نصیب سے نالاں ہی نظر آتے ہیں۔ایسا کیوں ہے کہ آپ کی جتنی راحتیں اور وسعتیں بڑھ رہی ہیں آپ کا سینہ اتنا ہی تنگ ہوتا جارہا ہے!!!

الحمد للہ پڑھیئے، شکر ادا کیجیئے خالق کی ان نعمتوں کا جن کا شمار بھی نہیں کیا جا سکتا۔اللھم اعنی علی ذکرک و شکرک و حسن عبادتک۔آمین

مگر جب بھی گزرتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں

ہمارے ملک میں لوگ ''قلم'' کو لکھنے سے زیادہ شلوار میں ناڑا ڈالنے کے کام میں استعمال کرتے ہیں۔وہ قوم سماجی، معاشی اور تعلیمی ترقی کیسے کرے گی جو میراثی کو استاد، درزی کو ماسٹر، جاہل کو درویش، ظالم کو طاقتور، کم ظرف کو میر، وڈیرے کو سائیں، داداگیر کو بھائی اور کسی بھی ننگے پاگل کو شخص کو بابا جی مانتے ہیں۔سوچیئے۔

کتاب عرض ہے سے اقتباس

منوّر رانا کا ''بغیر نقشے کا مکان'' تحسین منوّر

ہم نے کتاب عرض میں اس بار یوں ہی خوامخواہ منوّر رانا صاحب کے بغیر نقشے کے مکان میں داخل ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ہوا یوں کہ گزشتہ دنوں منوّر رانا صاحب کے ساتھ پریس کلب آف انڈیا، دہلی میں ایک شام بتانے کا موقع مل گیا تھا۔وہاں ان کے ہر شعر پر وہ صحافی بھی داد و تحسین بلند کررہے تھے جو گزشتہ کئی ماہ سے نمومیڈیا کے شکار ہیں۔حالانکہ منوّر رانا صاحب کی شاعری جو ملک کی صورتِ حال پر تبصرہ کرنے سے بھی نہیں چوک رہی تھی انہیں بھی نشانہ بنانے سے پرہیز نہیں کررہی تھی۔نہ جانے کیوں ان کے ساتھ کریم ہوٹل میں مغز کھانے کے بعد دماغ کا کون سا گوشہ متحرک ہوگیا کہ والد مرحوم حضرت پروانہ رُدولوی مرحوم کا ایک جملہ ذہن میں کوند گیا ''منوّر رانا کو سمجھنا ہو تو ان کی نثر کا مطالعہ کرو، وہ شاعری سے اچھی نثر کہتے ہیں''۔اس کے بعد ہم نے اپنی کتابوں کی الماری میں کئی بار غوطہ لگایا تب کہیں جاکر ہمارے ہاتھ ان کا وہ بغیر نقشے کا مکان آیا یا جو انہوں نے کبھی ابّا کی خدمت میں پیش کیا تھا۔اب آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ ہمارے جیسا انسان جو کہ سول انجینئرنگ کرنے کے باوجود اُردو کی محبت میں ادیب کامل اور ایم اے اُردو کرکے اُردو والوں کی ہی طرح بغیر نقشے کے مکان میں رہ رہا ہو اس پر ان کے اس بغیر نقشے کے مکان کا کیا اثر پڑا ہوگا۔بس یہ سمجھ لیجئے کہ ہم نے یوں تو اپنے والد صاحب کی کئی باتوں کو ہو بہو یوں ہی نہیں مانا جب تک کہ خود تجربہ نہیں کرلیا مگر ان کی اس نثر کو پڑھنے کے بعد ہمیں بھی یہی محسوس ہوا کہ منوّر رانا کی شاعری کے مقابلے میں اگر تولا جائے تو ان کی نثر بھاری نکلے گی مگر جب ان کی شاعری کی حفاظت میں ان کی شاعری میں موجود ماں کی ممتا آجائے گی تب ان کی نثر کو احتراماً خود کو کمزور کرنا ہی پڑے گا۔بغیر نقشے کا مکان ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی تھی، اس کے بعد ان کے انشائیے اور خاکے ۲۰۰۷ء میں ''چہرے یاد رہتے ہیں'' کے نام سے منظر عام پر آئے تھے۔اس کے علاوہ ڈھلان سے اُترتے

ہوئے ،پھنگ تال اور سفید جنگلی کبوتر میں بھی ان کی نثر کا کامیاب اثر دیکھا جاسکتا ہے۔لیکن آج ہم بغیر نقشے کا مکان عرض کرنا چاہتے ہیں۔بغیر نقشے کا مکان کیا ہے بلکہ کلکتہ کا ادبی منظر نامہ ہے۔ادبی منظر نامہ ہی نہیں بلکہ اردو کی چلتی پھرتی تہذیب ہے۔ اُردو کی چلتی پھرتی تہذیب ہی نہیں بلکہ قدم قدم پر تڑپتی زندگی ہے۔تڑپتی زندگی ہی نہیں یہ منوّر رانا کے ذریعے آباد کی جارہی لفظوں کی ایک ایسی کہکشاں ہے جہاں ہر جملہ جو سہل سا لگتا ہولیکن بہت بڑی بات ایسی دلکشی کے ساتھ ادا کر دیتا ہے کہ پڑھنے والا اس میں ڈوب جاتا ہے۔ہم نے سوچا تھا کہ ایک ہی نشست میں اسے پلٹ کر رکھ دیں گے مگر نہیں کتاب ہر وقت ساتھ چلتی رہی۔جن لوگوں پر خاکے ہیں وہ ساتھ ساتھ ذہن میں جگہ بناتے چلے گئے۔وہ ماحول، وہ تہذیب، وہ تمام وارداتیں جو اس میں رقم ہیں پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی تھیں۔اس پر سے ہمارا سماج سے بار بار کا فون ،کہاں ہے کتاب عرض ہے؟ ارے انہیں کون بتائے جس بغیر نقشے کے مکان کا تذکرہ یہاں ہورہا ہے اسے یوں ہی نہیں لکھا جاسکتا۔اس کے احترام میں لفظوں کا جہاں آباد کرنا پڑتا ہے۔ذرا جملوں کی باغ و بہار صورت تو دیکھئے۔’’علم کی دیوی سرسوتی اپنے مندر میں سیاسی مجرے کی اجازت کبھی نہیں دے سکتی ہے‘‘۔

’’ادب رکھیل کی طرح نہیں ہوتا کہ جس کے جسم اور سانسوں پر شہر کے کسی ایک رئیس کا قبضہ ہوجائے‘‘۔’’ادب کو زبان کی بنیاد پر تقسیم کرنے والے دہشت گرد تو ہو سکتے ہیں لیکن شاعر و ادیب ہر گز نہیں ہوسکتے‘‘۔اس شہر میں آئینے ہمیشہ کم فروخت ہوتے ہیں کیوں کہ یہاں ہر چہرہ آئینہ صفت رہا ہے‘‘۔’’ابھی جمنا کے مقدس پانی سے بزرگوں کے سجدوں کی خوشبو آتی ہے۔ابھی مقدس گنگا کی سنہری لہروں سے چندن ٹیکے کی مہک محسوس ہوتی ہے‘‘۔پروفیسر مظفر حنفی صاحب سے منوّر رانا کا جو تعلق ہے وہ ان کی شاعری اور مظفر حنفی جانتے ہیں مگر کلکتہ میں مظفر حنفی صاحب نے اپنے قیام کے دوران منوّر رانا کو حد درجہ متاثر کیا۔ان کے اُوپر لکھے خاکے میں کہتے ہیں۔’’ڈاکٹر صاحب کو کتابیں پڑھنے کا اتنا ہی شوق ہے جتنا بشیر بدر کو مشاعرے پڑھنے کا ہے۔سفر میں ڈاکٹر صاحب مستقل کتابیں پڑھا کرتے ہیں۔کتابوں سے تھک جاتے ہیں تو اسٹیشنوں کے نام اور مسافروں کے چہرے پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ہوٹل پہنچتے ہی ڈاکٹر صاحب پھر کتابوں کی ورق گردانی میں مشغول ہوجاتے ہیں۔کتابیں ختم ہوجاتی ہیں تو ٹیلی فون ڈائرکٹری پر نگاہِ کرم ڈالتے ہیں۔ڈائرکٹری سے لُطف اندوز ہوجاتے ہیں تو ہوٹل میں رکھی بائبل پڑھنا شروع کر دیتے ہیں‘‘۔اسی خاکے میں ایک جگہ اُردو کی حالت پر کمال کا جملہ تحریر کر دیتے ہیں۔ویسے اُردو کو لے کر اس پوری کتاب میں جا بجا ایسے طنز کے تیر و نشتر ہیں جو اُردو کی حالتِ زار کے مجرموں کو سیدھا نشانہ بناتے ہیں۔’’فی الوقت جتنے بھی ادبی خواجہ سرا ہیں وہ کسی نہ کسی سرکاری یا نیم سرکاری عہدوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں اور بے چاری اُردو غزل حرم سرا کی آبرو بھی ہے اور چوکیدار بھی‘‘۔ایک اور جگہ اسی خاکے میں لکھتے ہیں۔’’میں تو موجودہ اُردو ادب کے اربابِ اقتدار کی طرح قلم بیچ کر ریشمی دوشالہ خریدنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہوں‘‘۔

بغیر نقشے کے مکان میں آپ کا ہمارا سب کا ہی نشان ہے۔بغیر نقشے کے مکان کو غریب آدمی سے تعبیر کر کے انہوں نے آغاز میں ہی غریب آدمی کے ساتھ جُڑے زندگی کے ہر پہلو کو بغیر نقشے کا مکان قرار دیا ہے۔لیکن یہ کتاب اردو سے محبت کرنے والے ایسے ایسے لوگوں کو ہمارے سامنے لاتی ہے کہ جن سے ہم چاہے واقف نہ ہوں مگر اس نئی پہچان کے بعد محبت ضرور ہو جاتی ہے۔اس میں ایک خاکہ ثقلین حیدر صاحب کی کلکتہ میں ہوئی موت کے حوالے سے ہے۔ثقلین حیدر صاحب جب محرم میں رودولی آتے اور مجلسیں پڑھتے تو ان کی تقریر کو سن کر ہم لوگوں حیران ہوتے تھے کہ یہ انسان کیا اپنے دماغ میں کمپیوٹر فٹ کئے ہوئے ہے۔ان کے انتقال کا حال پڑھ کر رونا بھی آیا اور افسوس بھی ہوا کہ کیسا قابل اور بڑا انسان ہم لوگوں کو میسر تھا اور ہم دو گھڑی بھی اس کے قدموں میں بیٹھ کر علم کا ایک قطرہ تک نہیں لے پائے۔ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔’’سارے ہندوستان میں اردو کو عوام سے جوڑنے کا جتنا بڑا کام اکیلے ثقلین بھائی نے کیا ہے، چار پانچ اردو اکیڈمیاں مل کر بھی اتنا کام نہیں کر سکتیں۔جو شخص اردو کے حوالے سے کسی بھی بڑے سے بڑے انعام کا حقدار تھا، جو شخص لسانی یک جہتی کے تعلق سے کسی بھی بڑے عہدے کا دعویدار تھا، جو شخص قومی یکجہتی کی زندہ تصویر تھا، اسے کلکتہ میڈیکل کالج کے اربابِ اقتدار نے مریضوں کی بچی ہوئی دوا سے بچانا چاہا‘‘۔راحت اندوری کو مشاعرہ کا شاعر کہنے پر تلملائے۔منور رانا نے جب اس بات پر قلم اٹھایا تو انہوں نے کیا دلچسپ بات کہہ دی۔’’اگر قلم ان ذمہ داریوں کا ترجمان نہیں ہے تو پھر بہتر ہے کہ اسے شلواروں اور پاجاموں میں کمر بند ڈالنے کے لئے استعمال کیا جائے‘‘۔

بغیر نقشے کے مکان میں موجود انشائیے ہوں یا خاکے سب کے عنوان کسی شعر کا مصرعہ ہیں۔جگہ جگہ اشعار کی موجودگی سے ان کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے۔انور جلال پوری کے خاکے میں موجود یہ جملہ پڑھئے۔’’کچھ تو انور بھائی کا پوربی شرمیلا پن اور کچھ اقتدارانِ ادب کی بد دیانتی، دونوں نے مل کر ایک اچھے شاعر کو مشاعرے کا مداری بنا کر رکھ دیا‘‘۔عین رشید پر لکھے خاکے میں یہ آخری غضب کا جملہ پڑھیں۔’’ہم ایک مردہ پرست شہر کے باشندے ہیں۔یہاں ظفرؔ اوگانوی کے سب مخالف تھے، لیکن مرحوم ظفرؔ اوگانوی کے سب شیدائی ہیں‘‘۔بغیر نقشے کا مکان میں چاہے ہوٹل بازی کی بات ہو یا کبوتر بازی کا ماحول، بکرا منڈی میں ادیبوں اور شعرا کا غول ہو یا پھر چائے نوشی کے آداب کا تذکرہ یا پھر ٹیلی ویژن کی لعنت پر بات چیت ہو کچھ ایسا پڑھنے کو مل جاتا ہے کہ جگہ جگہ مشتاق احمد یوسُفی اپنی زرگزشت کے ساتھ آن موجود ہوتے

ہیں۔منور رانا نے ایک ایک جملے میں پوری زندگی نچوڑ کر رکھ دی ہے۔ایک مضمون میں جہاں وہ گاؤں سے شہر کی ہجرت کا تذکرہ کرتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ آپ کا گاؤں آپ کے ساتھ آن کھڑا ہوا ہے۔یہ منظر کشی فلموں کے پردے پر تو دکھائی دیتی ہے مگر نثر میں ناپید ہوتی جارہی ہے۔آخر میں اردو اخبارات کی حالت پر یہ پڑھ لیں۔''کلکتہ میں اردو اخبارات ایک دوسرے سے سخت ناراض رہتے ہیں۔بلکہ اگر ان تمام ایڈیٹروں کو سرکار ریوالور کا لائسنس دے دے تو شاید یہ لوگ ایک دوسرے کو قتل کرنے سے بھی گریز نہ کریں''۔لیکن چلتے چلتے یہ جملہ ضرور پڑھئے گا۔''اس زمانے میں اتحاد کا فقدان ہے۔مسجدیں تقسیم ہوگئی ہیں۔قبرستان بھی متحدہ ہندوستان کی طرح بٹوارے کی نذر ہوگئے ہیں۔لفظ اتحاد صرف ڈکشنری میں یا لیڈروں کی زبان پر رہ گیا ہے''۔

ہم نے آج کتاب عرض کے حوالے سے منوّر رانا کی شاعری اور ان کی نثر میں جنگ کرانے کی جو کوشش کی ہے وہ اسی صورت میں کامیاب ہوسکتی ہے کہ جب آپ ان کی نثر کو بھی ان کی شاعری کی طرح پڑھیں۔جیسا کہ ان کا کوئی شعر پڑھتے ہیں۔یقیناً آپ بھی ہمارے بات سے اتفاق کریں گے کہ وہ شعر بہت اچھے کہتے ہیں لیکن نثر بہت بہت بہت اچھی لکھتے ہیں۔ہمیں یقین ہے کہ بغیر نقشے کے مکان کے علاوہ ان کی دیگر تحریریں ہماری گواہی میں ضرور کھڑی ہوں گی۔ (بشکریہ ہمارا سماج، دہلی)

اسحاق ساجدؔ اور جمالِ دوست

امجد مرزاؔ امجد، لندن

اسحاق ساجد کا تعارف میرے محسن دوست جناب ڈاکٹر منور احمد کنڈے کی معرفت ہوا اور مجھے خوشی ہوئی کہ ایک نہایت مخلص، منکسر المزاج اور بہت اچھا شاعر دوست ملا۔ساجد صاحب جرمنی سے ایک ادبی مجلہ ''سمندر'' کے نام سے شائع کرتے ہیں اور ان کا پہلا شعری مجموعہ میرے سامنے اپنی خوب صورت شاعری کے ساتھ مجھے اس پر کچھ لکھنے کی دعوت دے رہا ہے۔میں بھلا اسحاق ساجد جیسے منجھے ہوئے شاعر کے متعلق کیا لکھ سکتا ہوں مگر ایک مہربان اور مخلص دوست کی پہلی کتاب کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کہنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔یوں تو ماشاء اللہ یورپ میں ایک نہیں ہزاروں شعرا اپنے کلام سے آب یاری کر رہے ہیں۔ہر سال بے شمار تخلیقات چھپتی ہیں کئی ادبی رسالے اور اخبارات کے صفحات یورپ کے ادیبوں اور شعرا و شاعرات کے خوب صورت کلام سے مزین ہوکر قارئین کے ذوق مطالعہ کی تسکین کا باعث بنتے ہیں درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں کتابیں ہر سال شاعری، افسانوں اور ناولوں پر مبنی شائع ہوتی ہیں۔مگر اسحاق ساجد صاحب کی کتاب کا سرورق دو خوب صورت گلاب کے پھولوں کی تصویر کے ساتھ نیلے بیک گراؤنڈ میں سنہری الفاظ کے ساتھ کتاب کے ٹائٹل کے ساتھ عام کتابوں سے منفرد اور اپنا انوکھا پن لیے ہوئے ہے۔انہوں نے دوستی کے تخیل کو خوبصورت گلاب کے پھولوں سے تشبیہ دے کر اپنے شاعرانہ مزاج کا اظہار کیا ہے۔فلیپ پر پاکستان کے نامور شاعر امجد اسلام امجد کی تحریر کے علاوہ دنیائے ادب، ہند پاک کے اعلیٰ لکھاریوں مثلاً ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، اختر شاہ جہاں، ڈاکٹر محمد اجمل نیازی کے ساتھ ساتھ برطانیہ سے محترمہ سلطانہ مہر، اکبر حیدرآبادی، خالد یوسف، سوہن راہی اور ڈاکٹر منور احمد کنڈے جیسے نامور تخلیق کاروں کی اعلیٰ وارفع تحریریں جس کتاب کے اوّلین صفحات پر ہوں وہ کتاب اور اس کا مصنف کس پائے کا شاعر ہوگا یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں اور پھر مجھے اپنی کم فہمی کے احساس نے مزید سرنگوں کر دیا کہ میں ساجد کے متعلق کیا لکھوں؟ جو چند آڑھی ترچھی لکیروں کے سوا کیا ہوگا.....!!

اسحاق ساجد سے میری بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی مگر یہ ان کا خلوص ہے کہ وہ ہمیشہ فون کرنے میں پہل کرتے ہیں اور گاہے بگاہے نہیں بلکہ تواتر سے خیریت دریافت کرتے رہتے ہیں۔اس مجموعے میں نعت، حمد، غزلیں، نظمیں، گیت شامل ہیں جو اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتے ہیں جیسا کہ ڈاکٹر مناظر عاشقؔ لکھتے ہیں کہ ''ان کے ذہن اور قلم کے ایک پہلو شاعری کو لیں تو وہ غزلوں اور نظموں کے ذریعہ آشنا حقیقتوں کی خیال افروزی کی طلسم کشائی کرتے نظر آتے ہیں۔''اسی طرح برطانیہ کے نامور شاعر جناب اکبر حیدرآبادی کا کہنا ہے کہ ''ساجد نظمیں بھی چھوٹی چھوٹی لکھتے ہیں مگر ان میں احساسات، خیالات اور موضوعات کا خاصہ تنوع ہوتا ہے اور الگ الگ سی چاشنی بھی!''ممتاز مضمون نگار اور شاعرہ محترمہ سلطانہ مہران کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ''اردو ادب کے مطالعہ کا ساجدؔ کو شوق ہے، انہوں نے اساتذہ کو پڑھا ہے ان کی فکر کو سمجھا ہے اور اپنے ادبی تجربے میں اس فکر کو پرویا ہے۔''

برطانیہ کے ایک اور ناقد، محقق اور ممتاز شاعر جناب خالد یوسف کا کہنا ہے کہ ''اسحاق ساجدؔ اگرچہ ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں لیکن اب کوچہ سخن میں ان کی آمد آمد کے نغمے سنائی دے رہے ہیں۔وہ ہر اچھے ادیب کی طرح ایک حساس دل اور سبک قلم رکھتے ہیں جو حال و مستقبل سے کہیں زیادہ خواب ناک ماضی سے اپنا رشتہ استوار رکھتے ہیں۔''یورپ، ہند و پاک کے مشہور گیت کار سوہن راہی ساجد کی شاعری پڑھ کر اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ ''جو شعر سادہ اور عام فہم ہو وہی اچھا شعر ہوتا ہے۔یہ کمال ایک یا دو برس کی بات نہیں بلکہ یہ ہنر سالہا سال کی محنت اور مشق کا نتیجہ ہے۔ساجدؔ صاحب اپنے قلم سے اپنے دل اور نگاہ کی بات ہم تک آسان طریقہ سے پہنچانے میں کامیاب ہیں۔''ڈاکٹر منور احمد کنڈے برطانیہ ہی نہیں ہند و پاک کے ممتاز شاعر ہیں اور بے شمار رسالوں میں باقاعدگی سے چھپتے ہیں پنجابی، اردو کے جانے مانے ہوئے شاعر ہیں۔تین مجموعوں کے خالق ہیں اور میرے

نہایت محترم استاد ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت مخلص دوست ہیں۔ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ اکثر شعراء کے متعلق اپنے خیالات کو منظوم کر کے پیش کرتے ہیں۔اپنے منظوم تبصرے کے علاوہ وہ لکھتے ہیں کہ ''جرمنی جیسے سنگلاخ علاقے کو اردو کی بہاروں سے معطر کئے ہوئے ہیں۔ان کی غزل اظہارِ ذات کی جلوہ گری ہے۔تشہیر ذات کا رنگ بالکل مفقود ہے۔ان کے محسوسات قاری کے اپنے محسوسات ہیں۔ان کی شاعری ایک کسک سے عبارت نظر آتی ہے وہ کسک جو حسن و رُومان کے خوب صورت جہان سے بھی تعلق رکھتی ہے اور ان کا عام انسان سے گہرا ربط ہے۔یعنی فکر وفن کی سطح اسحاق ساجدؔ کے ہاں ہموار ہے۔'' مشہور فلم ساز نزد علی فرتاشؔ صاحب نے تو اسحاق ساجدؔ کو اردو کا ''بلھا'' قرار دے دیا۔وہ اپنے جذبات کا اظہار ایسے الفاظ میں کرتے ہیں جن میں محبت کی خوشبو رچی ہوئی ہے اور یقین مانیے ان کے لکھے ہوئے یہ الفاظ عین میرے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں۔'' کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ آپ ان پر لکھنے بیٹھیں تو الفاظ کا چناؤ اور جملوں کی بنت کاری مشکل ہو جاتی ہے۔'' اب اندازہ کیجئے کہ جس شخص کے بارے میں دُنیائے اَدب کے نامور مورخ، محقق ایسے الفاظ میں پذیرائی کریں اس کے کلام، اس کی شاعری کو سچے جذبات کو سخن کے ترازو میں الفاظ کے موتیوں سے تول کر کاغذ پر نقش کر دیں اس کے بارے میں میرا جیسا کم علم و کم فہم کیا لکھے.....؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ ساجد ایک اچھا قلم کار ہے انہوں نے افسانہ لکھا تو بھی اپنے آپ کو منوایا اور جب شاعری کی تو بھی اپنی غزلوں، نظموں کے حصار میں قاری کو اس طرح جکڑ لیا کہ کتاب اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ساجد کی شاعری میں جہاں بقول اس کے جذبات و احساسات کی عکاسی ہے وہاں اپنے عہد کی بھی آئینہ دار ہے۔ زندگی کی صداقتوں کی امین بھی، وہ بھی دوسرے بڑے بڑے شاعروں کی طرح روح و دل کو پگھلا دینے والی دھیمی آگ میں جلتا ہے:

جرم ایسا بھی کیا ہم سے سرزد ہوا
اس قدر ہم سے کیوں ہے خفا زندگی

شاعر اپنے اشعار میں مختلف کیفیات میں نظر آتا ہے۔اسی طرح ساجد نے زندگی کے ہر موضوعات کو اپنے اشعار میں پرویا ہے اور کئی بار ان کے اشعار کی تھاپ سینے پر اس طرح لگتی ہے کہ دل تڑپ تڑپ جاتا ہے:

کہانی چھیڑتا ہوں چشمِ نم کی
عبارت لکھ رہا ہوں اپنے غم کی

کبھی وہ اپنا مقدر ریت پر لکھا دیکھ کر قلم سے نکلی ہوئی انوکھی بات سمجھتا ہے۔تو کبھی وہ ہر لمحہ کسی کو یاد کر کے اپنی غلطی سے برباد ہوتے محسوس ہوتے ہیں۔اسے دیکھ کر کبھی اس کی آنکھ نم لگتی ہے جیسے سارے غموں سے شاد ہو.....کبھی وہ اپنے خیالوں کے کھنڈر میں دعوت دیتا ہے جہاں کوئی دوسرا موجود نہیں۔کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ اگر وہ چھت پر نہیں آئیں گے تو چاند ستاروں سے سجی رات بھی کالی ہو جائے گی۔ساجد کے اشعار میں جذب کی کیفیت ملاحظہ ہو:

صرف اور صرف ترے سامنے میرے مولیٰ
سر جھکاؤں تو مرے ہاتھ سوالی ہو جائیں

وہ موت سے گلہ کرتا ہے کہ آس دل کو چھوڑ کر نہیں جاتی اور موت بھی ملنے نہیں آتی۔وہ دور کیا ہوا ان سے کہ زندگانی بھی اب نہیں بھاتی۔یاد میں آنسو بہاتا ہے مگر ہوا بھی کوئی خبر لاتی نہیں اور پھر سینہ سپر ہو جاتا ہے۔

آہ کا ساجدؔ نہیں ہوتا اثر
زندگی اب غم سے گھبراتی نہیں
ایک یہی ہم نے سبق سیکھا ہے ساجدؔ بخدا
دل کوئی تنگ اگر ہو تو کشادہ کرنا

بے شمار خوب صورت غزلیات اور نظموں، گیتوں کے بعد اسحاق ساجدؔ نے اختتامیہ پر ایک نہایت خوب صورت دعا لکھی ہے۔جس کا ہر شعر لاجواب ہے مگر ایک شعر کے ساتھ ختم کرتا ہوں:

صلہ دے مجھ کو خدماتِ ادب کا
مِرا ہر شعر خوش اسلوب کر دے

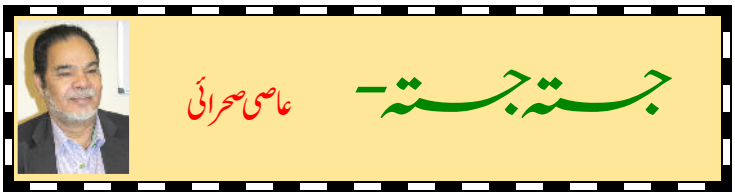

سچائی:: ایسی دوا ہے جس کی لذّت کڑوی مگر تاثیر شہد سے زیادہ شیریں ہے۔

کل میں انسان کی عظمت پہ لکھ رہا تھا کہ اچانک محلے میں شور اور بلند آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔باہر نکل کر دیکھا تو آدمی آدمی پر بھونک رہا تھا، ساتھ ہی گیلی مٹی پر کچھ کتے میٹھی نیند سو رہے تھے۔کرشن چندر۔

بڑی تلخ ہے یہ زندگی:

ساری عمر رشتے نبھاتے رہو بس ایک بار چوک جاؤ۔تو سارے رشتے رُوٹھ جائیں گے۔ساری محبتیں امتحان لینے لگیں گی۔سارے تعلق حساب مانگنے لگیں گے۔ ساری محبتوں اور کاوشوں، احسانوں پر سوالیہ نشان لگ جائے گا، شاید ہی یہ زندگی کسی کو راس آئی ہوگی، ساری عمر کی کاوشوں کو ایک بار کی بھول ضائع کرتی نظر آتی ہے۔بڑی تلخ ہے یہ زندگی۔

عجیب:

ہم جسم فروش عورت کو طوائف کہتے ہیں مگر اس کے جسم سے کھیلنے والوں کو کچھ نہیں کہتے ،ہم اسٹیج ڈراموں میں ہنسانے والوں کو میراثی کہتے ہیں ،لیکن اُن کو دیکھ کر ہنسنے والوں کو کوئی نام نہیں دیتے۔ہم گانا گانے والے کو کنجر کہتے ہیں مگر ان گانوں پر ناچنے والوں کو کوئی نام نہیں دیتے۔ہم حرام کھانے والوں کو حرامی کہتے ہیں مگر ان کے گھر جا کر کھانے والوں کو کوئی نام نہیں دیتے۔ہم رشوت خور کو تو حرام خور کہتے ہیں مگر خود رشوت دیتے ہیں اس پر اپنے آپ کو ملامت نہیں کرتے۔ہم دودھ میں ملاوٹ والے کو تو برا کہتے ہیں مگر دودھ والے کو کچھ نہیں کہتے۔ہم گند اُٹھانے والے کو بڑی نفرت سے چوڑا کہہ دیتے ہیں اور ہر جگہ سڑکوں پر اور اِدھر اُدھر گند ڈالنے والوں کو کچھ نہیں کہتے ۔جب تک ہم اپنی اِصلاح نہیں کرتے تب تک ملک میں کوئی انقلاب نہیں آ سکتا۔

ایک کسان:

اپنے گھر کی بلی سے تنگ آ کر اسے کہیں دور چھوڑ آیا۔اور فون کر کے گھر بیوی سے پوچھا۔تو بیوی نے بتایا کہ بلی تو گھر پہنچ گئی ہے۔کسان کہنے لگا اس کمینی کو کہو کہ مجھے آ کر لے جائے۔میں تو گھر کا راستہ ہی بھول گیا ہوں۔

دوسروں کی زندگی کو جہنم بنا کر اپنے سجدوں میں جنت ڈھونڈنا چھوڑ دو۔

ایک کہاوت:

ایک گاؤں کے ہوٹل میں ایک سیاح داخل ہوا اور منیجر سے کوئی کمرہ دکھانے کا کہا ۔سیاح نے ایک صد روپے ایڈوانس اسے ادا کئے اور مالک نے اسے چابی دی اور کمرہ دیکھنے کو بھیج دیا۔اسی وقت منیجر سے گاؤں کا قصاب گوشت کی رقم لینے آ گیا۔منیجر نے وہی سو روپے اُٹھا کر اسے دے دیئے۔کیونکہ اسے امید تھی کہ کمرہ اسے پسند آ جائے گا ۔قصاب نے وہ سو روپے اپنے جانور سپلائی کرنے والے کو دے دیئے۔جانور سپلائی کرنے والا اپنے ایک ڈاکٹر کا مقروض تھا جس سے وہ علاج کروا رہا تھا،اس نے وہ سو روپے اس ڈاکٹر کو دے دیئے۔وہی ڈاکٹر کئی دنوں سے اسی ہوٹل میں مقیم تھا۔اس نے وہی نوٹ اس ہوٹل کے مالک کو ادا کر دیا۔وہ سو کا نوٹ ابھی کاؤنٹر پر ہی پڑا تھا کہ کمرہ پسند کرنے کے لئے وہ سیڑھیاں چڑھ کر گیا ہوا متوقع گاہک واپس آ گیا اور ہوٹل کے منیجر کو وہ بتاتا ہے کہ اسے کمرہ پسند نہیں آیا ہے۔یہ کہہ کر اس نے اپنا سو روپے کا نوٹ اُٹھایا اور واپس چلا گیا!!!اکنامک کی اس کہانی میں نہ کسی نے کچھ کمایا اور نہ کسی نے کچھ خرچ کیا لیکن جس گاؤں میں وہ سیاح نوٹ لے کر آیا تھا اس گاؤں کے کئی لوگ قرضے سے فارغ ہو گئے۔

حاصل مطالعہ: پیسے کو گھماؤ! نا کہ اس پر سانپ بن کر بیٹھ جاؤ اسی میں عوام کی فلاح ہے۔کسی بے قصور انسان کو ذلیل کرتے وقت آپ اسے اسکی اوقات یاد نہیں دلا رہے ہوتے بلکہ اپنی اوقات دکھا رہے ہوتے ہیں۔

آنسو۔ایک دن موم بتی کے اندر کے دھاگے نے اس سے کہا ''جلتا تو میں ہوں مگر تیرے آنسو کیوں نکل آتے ہیں؟ موم بتی نے جواب دیا۔''جس کو دل میں جگہ دی ہو،اگر وہ تکلیف میں ہو تو آنسو نکل ہی آتے ہیں''۔

ماؤزے تنگ راہنمائے عوامی جمہوریہ چین:

میری قوم ایک عرصے سے مغرب کی غلام تھی،افیون ہماری کاشت تھی،جہالت کے انبار تھے، پھر میں نے ان جہلاء کو پڑھانے کی کوشش کی ،جنہوں نے علم کو جھٹلایا دیا میں نے اُن سے ووٹ کا حق ہمیشہ کے لئے چھین لیا۔اور ووٹ کا اختیار صرف علم والوں کو دے دیا چنانچہ اسی گھسی پٹی جمہوریت سے انقلاب برپا کر دیا،آپ کا تو قرآن کہتا ہے کہ ''جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر نہیں ہو سکتے'' پھر آپ کے آئین میں جہلاء کو یہ حق کیوں دیا گیا ہے۔

ذرا سوچیئے! کیسی عظیم قوم ہیں ہم

ہم جس ملک میں رہتے ہیں۔وہاں پیزا پولیس سے پہلے تیز رفتاری سے ہمارے گھر پہنچ جاتا ہے۔ہمیں کار لینے کے لئے سو فیصد قرضہ مل جاتا ہے جبکہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بیس فیصد قرضہ ملتا ہے۔چاول ایکسو بیس روپے اور سم کارڈ فری مل جاتی ہے۔ہمارے ہاں جوتے خوبصورت ایرکنڈیشنڈ دوکان میں سے ملتے ہیں جبکہ سبزیاں جو ہم کھاتے ہیں وہ فٹ پاتھ پر ملتی ہیں۔ایک شخص جس کے باس ایم ایس سی کی اصلی ڈگری ہے وہ بے روزگار ہے جبکہ ان پڑھ اور جعلی ڈگری ہولڈر قومی اور صوبائی اسمبلیوں کا ممبر ہے۔

اچھے لوگ:

اچھے لوگ روشنوں کی مانند ہوتے ہیں جو فاصلوں کو کم تو نہیں کر سکتے لیکن منزل کو اپنے معقول مشوروں سے آسان ضرور بنا دیتے ہیں۔

عورت کا مقام:

اُس معاشرے میں عورت کا مقام کیسے بلند ہو سکتا ہے جہاں مردوں کی لڑائی میں گالیاں ماں بہن کی دی جاتی ہیں۔

افسوس: اظہر عباس ہاشمی وفات پا گئے - اناللہ وانا الیہ راجعون

تسلیم الٰہی زلفی
(ٹورونٹو)

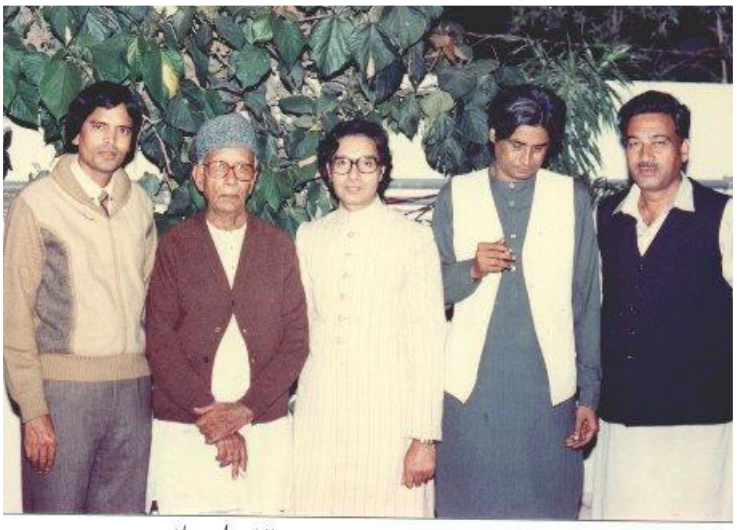

کراچی کے اعزازی مشاعرے میں مہمان خصوصی تسلیم الٰہی زلفی، تابش دہلوی، پیرزادہ قاسم نیئر بن سوز اور اظہر عباس ہاشمی

جدہ میں 'شام فراز' کی نظامت تسلیم الٰہی زلفی نے کی، اس موقعے پر شاعر لکھنوی اپنا کلام سنا رہے ہیں
محسن بھوپالی، منظر ایوبی، احمد فراز اور عاشق کیرانوی محوِ سماعت ہیں

ابھی ڈاکٹر شفیق علوی صاحب کی وفات پر بہنے والے آنسو خشک بھی نہ ہوئے تھے کہ اب کراچی سے ساکنانِ شہرِ قائد عالمی مشاعرہ انتظامی کمیٹی کے روح رواں اور کراچی یونیورسٹی کے ہمارے سینئر ہم سبق ساتھی اظہر عباس ہاشمی بھی چل بسے ساکنانِ شہرِ قائد سالانہ عالمی مشاعروں کے انعقادی سلسلے سے قبل ۱۹۸۰ء کی دھائی میں جب اظہر عباس ہاشمی مڈل ایسٹ میں کاروبار کیا کرتے تھے اور ہم بھی جدّہ میں مستقل آباد تھے۔۔تو یہ ہر سال پاکستان کے ممتاز سینئر شعراء کرام کو اپنے ادارے کے خرچے پر عمرہ کروانے کے لئے لاتے تھے۔ اور پھر اُن تمام شعراء کرام کا قیام وطعام اور اعزازی مشاعرہ بالعموم میرے غریب خانے پر ہی ہوا کرتا تھا۔۔لیکن میرے بیحد اسرار کے باوجود خود انہوں نے ہمیشہ ہوٹل میں قیام کیا۔جن شعراء کرام کو انہوں نے سعادتِ عمرہ کا موقع دیا میں سے کچھ کے اسمائے گرامی اپنی یادداشت کے سہارے لکھ رہا ہوں: تابش دہلوی، شاعر لکھنوی، محشر بدایونی، محسن بھوپالی، صہباء اختر، دلاور فگار، راغب مرادآبادی، سرشار صدیقی، منظر ایوبی، طفیل ہوشیار پوری، اختر لکھنوی، کلیم عثمانی، مظفر وارثی، عاشق کیرانوی، قمر وارثی، اور بہت سارے شامل ہیں۔ابھی سالِ گذشتہ ۲۰۱۵ء مارچ ہی کے مہینے میں جب انہوں نے ہمیشہ کی طرح ہمیں شہرِ قائد کے سالانہ مشاعرہ میں شریک کیا، تو ہم نے اُن کے اس وعدہ پر ہامی بھری کہ وہ جلد کینیڈا کا چکّر لگائیں گے۔لیکن ہمیں کیا معلوم تھا کہ اب کینیڈا وہ نہیں۔اُن کے مرنے کی خبر آئے گی۔اور آئندہ ہمیں ان سے ملاقات کے لئے کراچی میں اُن کے گھر نہیں۔قبرستان جانا ہوگا

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ...

سوگوار: تسلیم الٰہی زلفی (ٹورونٹو)

President
Urdu TV Canada
24 Hrs. Urdu Channel ROGERS 851
Since January 2000 in Toronto
URDU TV CANADA
Tasleem Elahi Zulfi
Newscaster & Show Host
تسلیم الٰہی زلفی
142 Oxford Street
Richmond Hill, Ontario
L4C 4L7
Canada
Mobile: 416 737 3458
Res/Fax: 905 780 1916
E-mail: zulfi@rogers.com
Website: www.zulfi.ca

Tasleem Elahi Zulfi
Executive Director
University of Karachi
Graduates Forum Canada
جامعہ کراچی
فارغ التحصیل المنائی فورم کینیڈا
uok-graduates-forum-canada@rogers.com 416 737 3458

انجمن اُردو کینیڈا
Urdu Society of Canada (Since 1972)
سرپرست: فیض احمد فیض (مرحوم) بانی: حفظ الکبیر قریشی (مرحوم)
ایگزیکیٹو ڈائریکٹر: تسلیم الٰہی زلفی ۔ ٹورونٹو
urdu-society-ofcanada@rogers.com 416 737 3458

Radio Pakistan Karachi
BAZM E TALABA FORUM
Canada, USA & UK
ریڈیو پاکستان کراچی
بزم طلباء فورم
کینیڈا، امریکا اور برطانیہ
سرپرست: یاور مہدی
چیف آرگنائزر: تسلیم الٰہی زلفی
416 737 3458
radio.pakistan.btf@gmail.com